''اداس نسلیں''

تنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے ادبیاتِ اُردو

مقالہ نگار

نیلم

ایم۔اے اُردو (سالِ آخر)

نگران

سہیل احمد

شعبۂ اُردو جامعۂ پشاور

شعبۂ اُردو جامعۂ پشاور

۲۰۰۵۔۰۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

والدین

اور

ماموں صدیق اللہ کے نام

فہرست

پیش لفظ

ایم۔اے کے سلسلے میں مقالہ لکھنے کے لیے ہمارے سامنے جو موضوعات موجود تھے ان کی نوعیت مختلف قسم کی تھی۔ میری نظر جس موضوع پر جا کر ٹھہری وہ عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' تھا۔ اس کی بڑی وجہ میری افسانوی ادب سے لگاؤ ہے۔ افسانوی ادب اور خصوصاً ناول سے دلچسپی کے باعث میں نے بغیر جھجک کے اس موضوع کو اپنے ایم۔اے کے مقالے کے لیے منتخب کیا۔

اردو کے سنجیدہ ناول نگاروں میں چند ہی نام شامل ہیں۔ جن میں عبداللہ حسین کا نام بھی ایک معتبر نام ہے اور ان کا ''اداس نسلیں'' چند ہی اہم ناولوں میں سے ایک ہے، اردو کے تقریباً تمام ناولوں پر کسی حد تک تحقیقی کام ہو چکا تھا۔ لیکن اس ناول میں تشنگی پائی جاتی تھی اس تشنگی کو کسی حد تک دور کرنے کے لیے میں نے اس پر مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ عبدااللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' میں فرد کے خارج کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیات کی گرہیں بھی کھولی ہیں۔

اس مقالے کو میں نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب ناول کا فن اور ارتقاء کے عنوان سے ہے جس میں ناول کے فن اور ارتقاء پر بات کرتے ہوئے ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور ساتھ ہی ابتداء سے لے کر ''اداس نسلیں'' کے دور تک ناولوں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''اداس نسلیں فنی نقطہ نظر سے'' کے عنوان سے ہے اس میں ''اداس نسلیں'' کا فنی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور ناول کی تکنیک، پلاٹ، کردار، منظر نگاری اور زبان واسلوب پر بات کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں ناول کا فکری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے اور آخری باب میں ناول کا ادب میں مقام متعین کیا گیا ہے اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور مقالے کا مجموعی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس مقالے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے بنیادی اور ثانوی ماخذ کے حصول کے سلسلے میں، میں نے مختلف

لائبریریوں سے استفادہ کیا۔جن میں شعبہ اردو جامعہ پشاور کی لائبریری، پشاور یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری، پشاور پبلک لائبریری، میاں سعید الرحمٰن کی ذاتی لائبریری، سٹیشن ہیڈ کواٹر پشاور کینٹ کی لائبریری شامل ہیں۔

اپنے اساتذہ کرام ڈاکٹر صابر کلوری اور خصوصاً ڈاکٹر روبینہ شاہین کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔جنہوں نے کتب کی فراہمی میں میری ہر ممکن مدد کی۔

اس کے علاوہ اپنے لائبریرین سر اسحاق، بھائی اختر گل، اپنے پیارے بھائی آفتاب احمد لیکچرر سعید شیر مہمند اور اپنے ماموں توصیف اللہ کی بھی ممنون ہوں۔جنھوں نے میری ہر ممکن مدد کی۔

اپنی سہیلیوں، صدف، شائستہ، عاصمہ ناز، حلیمہ، اور خصوصاً آسیہ کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ جنہوں نے اس کام کے سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کی۔

آخر میں اپنے نگران سر سہیل احمد کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض بنتا ہے جو اس تحقیقی کام کے سلسلے میں آغاز سے اختتام تک میرے ساتھ رہے انھوں نے نہ صرف مقالے کے مختلف ابواب کی تصحیح کی بلکہ اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔سر کی ایک بات ''پریشانی کسی مسئلہ کا حل نہیں اور ہر کام صبر سے کریں'' میرے لیے زندگی کا سنہری اصول بن گیا۔

ایک بار پھر اپنے نگران اور دوستوں کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتی ہوں۔جنہوں نے اس تحقیقی مقالے کے سلسلے میں میری رہنمائی اور مدد کی۔

اس مقالے کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جو ''بے شک ہر چیز پر قادر ہے۔''

نیلم

ایم۔اے (سال آخر) ۲۰۰۶ء ااا

باب اوّل

''ناول کا فن اور ارتقاء''

۱) ناول کا فن

۲) ناول کے عناصر

ا) قصہ یا کہانی

ب) پلاٹ

ج) کردار نگاری

د) منظر نگاری

ر) زبان و اسلوب

ز) نظریۂ حیات

۳) اردو ناول کا ارتقاء

ناول کا فن:۔

ناول اطالوی زبان کا لفظ NOVELLA سے نکلا ہے۔لغت کے اعتبار سے ناول کے معنی نادر اور نئی بات کے ہیں۔لیکن صنفِ ادب میں اس کی تعریف زندگی کے حقائق بیان کرنا ہے۔ یوں اگر اس کی جامع تعریف کی جائے تو وہ کچھ یوں ہوگی کہ ناول ایک ایسا نثری قصہ ہے جس میں پوری زندگی کا احاطہ کیا جاتا ہے۔روزمرہ واقعات و حادثات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کو اٹلی والے ناولا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ان کی بنیاد رزمیہ کہانیوں اور داستانوں پر رکھی جاتی تھی۔ بالعموم ایسی داستانیں پھیری لگا کر گانے والے پیشہ ور خانہ بدوش فقیروں کی زبانی یا پھر اُن لوگوں کے ذریعے جو داستان گوئی کو بطور پیشہ اختیار کر لیتے تھے، بیان کی جاتی تھیں اور داستان کو محفلوں اور مجلسوں میں سناتے۔اس طرح آہستہ آہستہ ان داستانوں کا شمار قومی ادب میں ہونے لگا۔

ناول نے اس وقت جنم لیا جب داستانیں بدلتی اقدار کا ساتھ دینے سے معذور ہو گئیں۔تاہم اپنے مخصوص انداز اور ہیئت کے باوجود ناول، قصہ، کہانی ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔داستان گو داستان کی تخلیق میں قوتِ متخیلہ سے خارجی دنیا تخلیق کرتا ہے۔جبکہ ناول نگار ایک جیتے جاگتے ہنستے بستے سماج کی حقیقی تصویر کشی کرتا ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ناول کے لفظ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ناول لفظ ہمارے یہاں مغربی ادب اور بالخصوص انگریزی اثر سے آیا۔
> اس کا اطلاق نثر میں ایسے مضمون پر ہوتا ہے جن میں ایک واضح اور منظّم
> پلاٹ ہو۔اور جس میں خیالی کہانیوں کی بجائے زندگی کے مسائل معاملات
> اور واقعات بیان کیے جائیں۔'' (۱)

۱۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی آج کا اردو ادب اور ناول ص:۱۹۷

ناول میں چونکہ زندگی کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اس لیے ناول نگاری میں وہی لوگ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جنہوں نے زندگی کا گہرا مشاہدہ کیا ہو۔ انسانی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش میں ناول نگار زندگی کی نئے سرے سے تخلیق کرتا ہے۔ مشہور ناول نگار ڈنٹیل ڈفو نے سب سے پہلے اس کی بنیاد ڈالتے ہوئے دو چیزوں کا خاص طور خیال رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ قصہ گو کو حقیقت نگار ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔

سمولٹ کے نزدیک ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے۔ جس میں ایک مقرر پلاٹ واضح کرنے کے لیے زندگی کے کردار مختلف جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے ہیں۔ انگلستان کی ایک ادیبہ کلاریوز کے مطابق:

''ناول اسی زمانے کی معاشرت اور زندگی کی سچی تصویر ہوتی ہے جس میں وہ لکھا جائے۔'' (۱)

ناول کے فن کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ذریعے حقائق حیات کی آئینہ سامانی ہو۔ ناول کا فن معاشرے کی سرگرمیوں اور ان سے پیدا ہونے والی مختلف کیفیات کی عکاسی کرتا ہے۔

ناول کا فن حقائق حیات کی روشنی میں نکھرتا اور سنورتا ہے۔ دلچسپی اور تجسّس کا عنصر اس میں جاذبیت برقرار رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری حظ اٹھاتا ہے۔ ناول کے ذریعے ناول نگار زندگی کے معاملات و مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ زندگی چونکہ ایک تغیر پذیر قوت ہے۔ اس لیے فطری طور پر زندگی کے تغیرات ناول کے فنی مزاج میں بھی تغیرات برپا کرتے ہیں۔ زندگی ایک وسیع لفظ ہے۔ حیات و کائنات کے تجربات کا بیان دراصل تکنیکی طور پر ناول کو بناتا ہے۔ تجربات کے فنکارانہ ارتباط سے قصے کی فضا تیار کی جاتی ہے اور ماحول بنایا جاتا ہے۔ ہر قصے کا انحصار کرداروں پر ہوتا ہے اور یہی کردار ناول کو آگے بڑھاتے اور انجام تک پہنچاتے ہیں۔

آل احمد سرور ناول کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ناول ایک سلسلہ قصے کا دوسرا نام ہے، ناول دراصل طویل دورانیے کے ایسے قصے کو کہتے ہیں، جس میں پورا عہد سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اس کے

۱۔ کلاریوز ناول کی تاریخ و تنقید ص: ۴۳۔۴۴

کردار حقیقی ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ اس پلاٹ کا خمیر زندگی سے اٹھایا جاتا
ہے۔'' (۱)

ناول اور زندگی کا فن ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ ناول کو زندگی اور زندگی کو ناول کے آئینہ میں دیکھ لینا دشوار نہیں۔ ناول سے زندگی کے اس گہرے رشتے کا تذکرہ کرتے ہوئے رائف فوکس نے ایک اہم نکتے کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''ناول فرد کی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ یہ سماج اور فطرت کے خلاف فرد کی جدوجہد کا رزمیہ ہے۔ یہ ایک ایسے سماج میں ترقی کرسکتا ہے جہاں فرد اور سماج کا توازن گم ہو کر رہ گیا اور جہاں انسان اپنے گردوپیش کے حالات یا فطرت سے جنگ آزما ہو۔'' (۲)

ناول کے عناصر:۔

ناول نگاری کا سلسلہ اصل میں اس وقت شروع ہوا۔ جب تہذیبِ انسانی نے پختگی کی منازل طے کرنا شروع کی تھں اور ان بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ قصہ نگار اپنے عہد کے انسانی مسائل و معاملات کا بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد سچی تصویر سامنے لائے۔ ناول کے فن کی تشکیل و تکمیل کے لیے درج ذیل عناصر ترکیبی کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

ا) قصہ یا کہانی

ب) پلاٹ

ج) کردار نگاری

د) منظر نگاری

ر) زبان و اسلوب

ز) نظریۂ حیات

۱۔ آل احمد سرور تنقیدی اشارے ص:۲

۲۔ Ralfox The novel and People P.No.74

الف) قصہ یا کہانی:۔

ناول کا سب سے اہم عنصر قصہ یا کہانی ہے۔ عام طور پر ناول محض قصہ ہی سمجھا جاتا ہے اور عام ناول میں قصہ کے سوا کچھ اور ہوتا بھی نہیں۔ مگر اعلیٰ سے اعلیٰ ناول بھی بغیر قصہ کے وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس میں قصہ پن ہی ہلکا ہو۔ قصہ ہی ناول کو ناول کہلانے کا مستحق بناتا ہے۔

ای۔ ایم فاسٹر جو ایک کامیاب ناول نگار ہیں۔ ناول میں قصہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قصہ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔''(۱)

قصہ کی تعریف عام طور پر یوں کی جاتی ہے کہ وہ کچھ ایسے واقعات و تجربات ہوتے ہیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے ہوں۔ واقعات و تجربات کا یکے بعد دیگرے یا ایک وقت کے بعد دوسرے وقت میں ہونا قصہ کی جان ہے۔ ہر قصہ میں یہ بیان ہوتا ہے کہ پہلے یہ ہوا، پھر یہ، اور آخر میں نتیجہ یہ ہوا۔

ہر قصہ میں ایک شروع کا واقعہ ہوتا ہے۔ پھر کچھ درمیانی واقعات ہوتے ہیں اور آخر میں کوئی خاص واقعہ، جسے نتیجہ کہنا چاہیے۔ قصہ میں وقت کے حوالے سے ترتیب بہت ضروری ہے۔ ہماری زندگی میں ہر بات ایک وقت میں نہیں ہوتی اس لیے قصہ میں وقت کا تعین پھر بعد کے وقتوں یعنی ابتداء، درمیان اور آخر کا التزام ضروری ہے۔

ناول میں قصہ کی بنیاد انسانی زندگی پر ہوتی ہے اور اس میں روزمرہ کی زندگی کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ ناول نگار اس کہاوت پر عقیدہ رکھتا ہے۔ کہ حقیقت، جھوٹ سے زیادہ تعجب انگیز ہے۔ ناول کا نام ناول (یعنی ایک نئی چیز) اس لیے پڑا کہ اس میں پرانے افسانوں کے برخلاف انسانی زندگی کا قصہ ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں سب سے پہلی قصہ کی کتاب جو ناول کہی گئی وہ رچرڈسن کی ''پامیلا'' تھی۔ اور اس میں نیا پن یہ تھا کہ اس میں ایک خادمہ ''پامیلا'' کا ''لارڈبی'' کے ساتھ عشق کا قصہ بیان ہوا تھا اور دیو، پریوں کی جگہ انسانی زندگی کی ایک کہانی بیان کی گئی تھی۔

ب) پلاٹ:۔

پلاٹ سے مراد واقعات کا وہ خاکہ ہے۔ جس کو ناول نگار شروع سے پیش نظر رکھتا ہے اور قصہ کے

۱۔ ڈاکٹر احسن فاروقی   ناول کیا ہے؟   ص:۱۷

دلچسپ ہونے کا انحصار بھی اس کی ترتیب پر ہوتا ہے۔ ناول کے پلاٹ کی تشکیل کا فن ،تعمیر کے فن کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ اچھی تعمیر کے لیے جس طرح تکنیکی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح عمدہ پلاٹ کے لیے بھی تکنیکی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح جس طرح معمار، عمارت کو خوبصورت بنانے کے لیے اس کے مختلف حصوں کو سلیقے اور خوش اسلوبی سے ملاتا اور جوڑتا ہے۔ اسی طرح ناول نگار، ناول کے پلاٹ کے مختلف اجزاء کو خوبصورتی کیساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ پلاٹ کے یہ اجزا جتنی احتیاط سے فطری طور پر مربوط ہوتے ہیں۔ پلاٹ اتنا ہی مکمل، موثر اور دلکش ہوتا ہے۔

تشکیل کے اعتبار سے پلاٹ عموماً دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱) چست، Compact یا منظّم

۲) ڈھیلا ڈھالا، Loose، یا غیر منظّم

منظّم یا چست پلاٹ میں اجزائے ترکیبی میں توازن قائم رکھا جاتا ہے اور ایک واقعہ دوسرے واقعے سے اس طرح منسلک رہتا ہے۔ جس طرح کسی مشین کے مختلف پرزے، اردو ناول میں مرزا رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' گھٹے ہوئے پلاٹ کی بہترین مثال ہے۔

جبکہ غیر منظّم یا ڈھیلا پلاٹ واقعات کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جس میں متعدد قسم کے واقعات ایک شخص سے متعلق ہوتے ہیں اور اُن واقعات میں ایک دوسرے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا۔ اردو ناول میں غیر منظّم پلاٹ کی ایک اہم مثال سرشار کا ناول ''فسانہ آزاد'' ہے۔

ناول کا معیاری پلاٹ دراصل وہ ہوتا ہے۔ جس میں ان دونوں کے توازن کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پلاٹ زیادہ ڈھیلا ہو۔ تو واقعات کا فطری تسلسل مجروح ہوتا ہے اور اگر سختی سے جامعیت کا لحاظ رکھا جائے۔ تو اس میں میکانکی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں ہی باتیں پلاٹ کے حسن واثر پر حرف لاتی ہیں۔ پلاٹ کے مجموعی تاثر کے حسن کو قائم رکھنے کے لیے اعتدال کی راہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی کچھ یوں کہتے ہیں:

''پلاٹ لچکدار ہو تو اچھا ہے ورنہ مکمل اور گھٹا ہوا پلاٹ ریاضی کا فارمولا ہوتا

....

ہے۔ بڑے ناول نگاروں کے پلاٹ مکمل گھٹے نہیں ہوتے۔ ورنہ قصے کی اثر
انگیزی ہی ختم ہو جائے۔''(۱)

ج) کردار:۔

افراد کے بغیر قصہ ترتیب نہیں پا سکتا۔ ارضی ماحول کو پیش کرنے کے لیے افراد کی ضرورت ہوتی ہے یہی افراد ناول کے کردار ہوتے ہیں۔ ناول نگار اپنے قصے میں واقعات کا جو پس منظر بیان کرتا ہے اس کے کرداروں کا بھی تعلق اسی ماحول سے ہونا چاہیے۔ ہماری معاشرتی زندگی مختلف طبقاتی پیمانوں میں منقسم ہے۔ رہن سہن، بول چال ،رسم رواج زبان و کلچر اور مذہب و مسلک میں بھی تنوعات ہے۔ اور اقتصادی اور معاشی اعتبار سے بھی تضادات موجود ہیں۔ ناول نگار جس طبقے ، معیار اور انداز و مزاج کو اپنے ناول کا موضوع بناتا ہے کردار بھی اُسی کے مطابق ہونے چاہیے۔ ناول کے کردار جتنے عام زندگی کے قریب ہوں گے اتنے ہی جاندار ہوں گے۔ اگر ناول کے کردار تخیل کے پیکر ہوں گے تو ارضی ماحول کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کرداروں میں اجنبیت اور مصنوعی پن نہ ہو۔ بلکہ ان کی سیرتیں اور عادات ماحول کے مطابق ہوں اور ان کے چہرے جانے پہچانے ہوں اور ان کرداروں کو مصنوعی اخلاقیات کا خول چڑھانے کے بجائے ان کی آلودگیوں کے ساتھ پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کردار کے بارے میں کہتی ہیں:

''کردار نگاری ناول کی جان ہے۔ قاری ناول کے ہر عنصر کو فراموش کر سکتا
ہے لیکن جیتے جاگتے ان کرداروں کو نہیں بھلا سکتا جنہیں ناول نگار نے اپنے
حقیقت نگاری سے زندہ جاوید بنا دیا۔'' (۲)

کردار دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مکمل (Round) کردار اور دوسرا سپاٹ (Flat) کردار، مکمل کردار بدلتے رہتے ہیں ان پر خارجی اور داخلی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جب کہ سپاٹ کردار ایک طے شدہ فطرت لے کر آتے ہیں وہ سدا ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے نہیں کہ سپاٹ کردار دلچسپ نہیں ہوتے۔ یہ بھی مکمل کرداروں کی طرح ناقابلِ فراموش ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اردو ناول میں سرشار کے خوجی اور نذیر احمد کے نصوح، کلیم،

۱۔ڈاکٹر احسن فاروقی ناول کیا ہے؟ ص:۲۳۔۲۴

۲۔ڈاکٹر شمع افروز زیدی اردو ناول میں طنز و مزاح ص:۲۹

اصغری اور اکبری کے کردار سپاٹ ہونے کے باوجود دلچسپ اور اثر انگیز ہیں۔ لیکن اس کے برعکس مکمل کردار زیادہ اثر رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ کردار اپنی سطح سے بلند ہو کر ہر زمانے کے کردار بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اردو ناول میں ''سیر کہسار''، ''جامِ سرشار'' اور ''امراؤ جان ادا'' میں ''امراؤ جان'' کے کردار بدلتے ہوئے ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔

مکالمہ ناول کو ڈرامے سے ورثے میں ملا ہے۔ اور یہ بھی ناول کا اہم جزو ہے۔ اچھے ناولوں کے مکالمے کرداروں کے حسبِ حیثیت اور فطری ہوتے ہیں اردو کے بعض ناول نگاروں نے مکالموں کو انتہائی فطری بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور ان کے ذریعے کرداروں کی گفتگو کو اصلی لب ولہجہ اور مقامی بولی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مکالمہ کے فطری ہونے کے سلسلے میں ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

> ''مکالمے کے لیے ضروری ہے کہ وہ فطری یعنی کرداروں کے حسب حال ہو۔ عمر، جنس، تعلیم، پیشے اور طبقے کے لحاظ سے انسانوں کی گفتگو کا انداز بدل جاتا ہے۔ اس لیے مکالمہ ایسا ہونا چاہیے۔ جس سے متکلم کے متعلق یہ سمجھا جا سکے کہ وہ کس عمر کا ہے مرد ہے یا عورت، پڑھا لکھا ہے یا ان پڑھ، کہاں کام کرتا ہے اور کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔'' (۱)

ایک بڑے ناول نگار کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ مکالموں میں برجستگی ہو۔ مکالمہ روزمرہ کی گفتگو کے مطابق ہو یا ہر لحاظ سے کرداروں کے حسبِ حال ہو۔ اور یہ کہ فن پارے کی ادبی چاشنی بھی اس کی وجہ سے کہیں متاثر نہ ہونے پائے۔

د) منظر نگاری:۔

کامیاب منظر نگاری کسی فنی شہ پارے میں جان ڈال دیتی ہے۔ شادی بیاہ کے رسوم ہوں یا میلوں ٹھیلوں کی بات، خوبصورت باغات، کوہ دشت وصحرا، جلسے جلوس، باراتوں اور موسموں کو بہتر طور پر پیش کرنا ہی کامیاب فن کاری ہے۔ قدرتی عناصر پیش کرنے میں ایک طریقہ یہ اپنایا جاتا ہے کہ مناظر کی عکس کشی بالکل مصوری کی طرح کی

۱۔ ڈاکٹر سہیل بخاری   اردو ناول نگاری   ص: ۳۱۔۳۲

جاتی ہے۔اوراس کے تاریک وروشن تمام پہلوؤں کوویسے کاویسا پیش کیا جاتا ہے۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کہانی یا کردار پران کے ماحول کے اثرات ملتے ہیں۔منظر نگاری میں ناول نگار الفاظ سے پورے ماحول کا نقشہ پیش کردیتا ہے ایک اچھا ناول نگار منظر نگاری کے عنصر کوملحوظ رکھتا ہے اور حالات وواقعات کے ساتھ ماحول اور مناظر کی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔

ر)زبان واسلوب:۔

ناول کے پیش کرنے میں ایک اہم وسیلہ زبان وبیان کا ہے۔کرداروں کی حرکات وسکنات اور جذبۂ فکرزبان وبیان کے ذریعے ہی سامنے آتے ہیں۔اچھے ناولوں میں زبان قصے کے مزاج کے مطابق ہوتی ہے اور قصے کے نشیب وفراز سے بھی اس کی مطابقت ہوتی ہے۔سنجیدہ زبان سے بہتر طور پر کسی مزاحیہ قصے کو پیش نہیں کیا جاسکتا اور مسرت کی زبان اظہارِغم کے لیے مناسب نہیں ہوتی ۔ قصے میں تخیل کی نزاکتوں اورفنی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ موزوں الفاظ،متوازن تراکیب اور چست فقروں کی موسقیت بھی ضروری ہے۔

ناول میں زبان کے حوالے سے سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

''ناول میں زبان،محض اظہاریت کوسہارا دینے کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے۔ ورنہ اصل زور،تو اُس واقعے اورخیال اور پھر اُس کے بعد کہانی کی بنت، پیش کش اور اگر کرداری ناول ہے،تو کرداروں کی کارکردگی پر ہوتا رہاہے۔مگراس کارکردگی کا بیان کرنا بھی تو ایک سلیقہ چاہتا ہے،جس سے پڑھنے اور سننے والے کی دلچسپی بڑے،اوراس پرناول نگارکی باتوں کا اثر بھی اس طرح پڑے کہ حواس خمسہ متاثر ہوں اورقاری یا سامع کے اُس ادبی ذوق کی تشفی ہوجواُس خاص دورکا ادبی ذوق ہو۔'' (۱)

زبان کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

''زبان دراصل وہ بنیادی قوت ہے جس پر واقعہ نگاری ، کردار نگاری ،

۱۔سید محمد عقیل جدید ناول کافن ص:۱۳۰

معاشرہ نگاری اور مکالمہ نگاری کا پورا دارومدار رہتا ہے۔ صاف وسادہ اور طاقت ور زبان ہی ان اجزء کو بحسنِ خوبی برتنے میں کامیابی دلاسکتی ہے۔''(۱)

ز) نظریۂ حیات:۔

کوئی بھی شخص جو کہانی بیان کر رہا ہو اس کا ایک واضح نقطہ نظر ہوتا ہے۔ایک بڑا ناول نگار زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھ کر پیش کرتا ہے۔ بعض چیزوں کو وہ پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔اس لیے اس کے ناول میں ہم کو فلسفۂ حیات کی بابت کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ہر ناول ایک فلسفۂ حیات کا عکس پیش کرتا ہے۔خواہ وہ عکس کتنا ہی دھندلا کیوں نہ ہوں۔

ناول میں عموماً دوطرح کا فلسفہ حیات ملتا ہے۔ایک تو ناول نگار بعض اوقات اپنے آپ کو نمایاں کر کے یا پھر کرداروں کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا ہے۔

عام طور پر تمام ادب میں اور خاص طور پر ناول میں بہتر طور پر فلسفۂ حیات پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔اس لیے کہ ناول نگار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ماہر نفسیات بھی ہو، ماہر تعلیم بھی، ماہر سیاسیات بھی اور ماہر اخلاقیات بھی اپنے مذہب، فلسفے، معیشت، اخلاق و معاشرت، عادات واطوار، انفرادی اور اجتماعی رجحانات اور میلانات پر اس کی گہری نظر رہی ہو۔

ایک اچھا ناول نگار اپنے نظریات کو کرداروں کی وساطت سے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کو بھی مدنظر رکھتا ہے کہ اس کی تخلیق محض اخلاقیات کا درس بن کر نہ رہ جائے بلکہ زندگی کا حقیقی روپ دکھانے کے ساتھ ساتھ مدعا بیان کرتے ہوئے کردار قارئین کے دلوں میں جگہ پاسکیں۔

معیاری اور کامیاب ناول میں یہ تمام عناصر واجزاء ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ناول نگار اپنی سلیقہ مندی سے ان کے بہترین اور مکمل امتزاج تک پہنچنے کی کاوش کرتا ہے۔ یہ امتزاج جتنا خوبصورت ہوتا ہے۔ناول اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔

۱۔ڈاکٹر اسلم آزاد   اردو ناول آزادی کے بعد   ص:۱۹

موضوعات کے اعتبار سے ناول کی عموماً دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ایک رومانی اور دوسرے نفسیاتی، رومانی ناول سے مراد ایسے ناول ہیں، جن میں قصہ کا دارومدار پلاٹ پر ہوتا ہے۔ان میں زندگی کی ترجمانی پر زور نہیں دیا جاتا۔ بلکہ تفریح کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔اور ایک لحاظ سے یوں کہہ لیں کہ زندگی سے فرار کی کوشش کی جاتی ہے۔ایسے ناولوں میں واقعات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔اور ان واقعات سے تفریح، اصلاح یا حصولِ مسرت کا کام لیا جاتا ہے۔ایسے ناولوں میں عجائب نگاری، مثالیت پسندی، بزم آرائی، اخلاق آموزی، محبت شعاری، حسن آفرینی اور تخیل کی بلند پروازی ملتی ہے۔

نفسیاتی ناولوں میں تخیل کا عمل دخل زیادہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت نگاری زیادہ ہوتی ہے اور ناول نگار تصورات کی دنیا میں کھویا نہیں رہتا۔ بلکہ وہ اپنی تخلیق میں اپنے گردو پیش کو اصل صورت میں پیش کرتا ہے۔اس کا موضوع جیتا جاگتا معاشرہ اور چلتی پھرتی دنیا ہوا کرتی ہے۔ایسے ناولوں میں کسی ملک کے رسم ورواج،عقائد اور رجحانات وغیرہ کی بالکل اسی طرح تصویر پیش کی جاتی ہے۔

۳)اردو ناول کا ارتقاء:۔

مغربی ادب میں ہی ناول کی بنیاد رکھی گئی اور مغرب کی مختلف زبانوں مثلاً انگریزی،فرانسیسی، روسی، جرمن میں کافی اعلیٰ پائے کے ناول تخلیق کیے گئے۔اگر چہ اردو ادب میں اعلیٰ اور معیاری ناولوں کی تعداد کافی کم بنتی ہے پھر بھی یہاں چند اہم ناول تخلیق کیے گئے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اردو ادب میں ناول کے ارتقائی سفر کا آغاز سرسید کے اصلاحی تحریک سے ہوا۔ جب انھوں نے واقعیت پسندی کے رجحان کو فروغ دینا شروع کیا تو اس طرح فرضی، ماحول کو پیش کرنے کے بجائے ارضی ماحول کو پیش کرنے کا آغاز بھی ہوا۔اور ان قصوں کے ذریعے زندگی کی مصوری کو اہمیت دی جانے لگی اور اس طرح اردو ناول میں ناول کے اولین نمونے نذیر احمد کے قصوں کی شکل میں منظر عام پر آئے۔

نذیر احمد کی پہلی تصنیف ’’مراۃ العروس‘‘ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد ’’بنات النعش‘‘، ’’توبتہ النصوح‘‘، ’’رویائے صادقہ‘‘، ’’ابن الوقت‘‘، ’’ایامیٰ‘‘ اور ’’فسانہ مبتلا‘‘ وغیرہ شائع ہوئیں۔ یہ اردو کے چند اولین

نمونے ہیں۔جن کے ذریعے ناول کی ابتدائی روایتوں کی تشکیل عمل میں آئی۔لیکن ڈاکٹر احسن فاروقی ان کتابوں کے تمثیلی پہلو پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''ان تصنیفات کے واقعی پہلو پر نظر کرتے ہوئے ان کو ناولیں بھی کہہ دیا گیا ہے اور یہ غلطی عام ہوگئی ہے کہ مولانا اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ان کی تصنیفات اس قدر کھلی ہوئی تمثیلیں ہی ہیں کہ ان کو ناول کہنے پر تعجب ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر تمثیلیں ہی ہیں اور ناول سے اسی حد تک ملی ہوئی بھی ہیں جس حد تک طویل نثری تمثیلوں کو ہونا چاہیے۔''(۱)

یہ بات درست ہے کہ نذیر احمد کے ان قصوں کے زیادہ تر کردار منفرد اوصاف کے حامل ہیں۔اور ان کے اندر ''اخلاقی مجسموں'' کی کیفیت اور خصوصیت بھی ہے۔لیکن اس ایک کمزوری کی وجہ سے نذیر احمد کے ان قصوں کی قدر و قیمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔یہ قصے اردو ناول کے نمونے بہر حال ہیں۔اس بارے میں وقار عظیم کہتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ نذیر احمد کے قصے اس مفہوم میں ناول نہیں ہیں جو ہم نے مغرب سے لیا،لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ناول کی داغ بیل انہی قصوں نے ڈالی۔''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' میں اس سے بھی زیادہ ''توبتہ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' اور پھر سب سے بڑھ کر ''فسانہ مبتلا'' میں آہستہ آہستہ وہ سارے خدوخال دکھائی دیتے ہیں جن سے ناول کے پیکر کی تخلیق و تعمیر ہوتی ہے۔'' (۲)

ڈپٹی نذیر احمد کے ان قصوں میں عام زندگی کی جو عکاسی ملتی ہے وہ اس سے پہلے کے قصوں میں نظر نہیں آتی۔ انہوں نے دہلی کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کے مسائل کا ذکر کیا ہے،اس کے علاوہ معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز پر بھی گہری نگاہ ڈالی ہے۔

نذیر احمد کے بعد اردو ناول کے ارتقائی حوالے سے اہم نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔سرشار کے ''فسانہ

۱۔ڈاکٹر احسن فاروقی — اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ص:۲۶

۲۔وقار عظیم — داستان سے افسانے تک — ص:۵۸

آزاد'' کو دوسرے سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔''فسانہ آزاد''اردو اخبار''اودھ پنچ''میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ان کی دیگر تصانیف میں''سیرِ کہسار''''جامِ سرشار''،''کامنی''اور''خدائی فوجدار''اہم ناول ہیں۔لیکن ان سب میں''فسانہ آزاد'' کو مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی وجہ سے سرشار کا نام اردو ادب میں زندہ ہے۔سرشار نے''فسانہ آزاد''میں خاص دور کی لکھنوی معاشرت اور لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا عکس دکھایا ہے۔

تشکیلی دور کے تیسرے اہم ناول نگار عبدالحلیم شرر ہیں۔ان کو تاریخ ناولوں کا بانی کہا جاسکتا ہے۔تاریخی ناول اور تاریخ میں اہم فرق یہ ہے کہ تاریخ میں واقعات اور کردار دونوں حقیقی ہوتے ہیں۔جبکہ تاریخی ناول میں نام چاہے حقیقی ہوں، واقعات، معاملات، مناظر سب ناول نگار کے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں۔(۱) یورپی ممالک کی سیاحت کے دوران شرر نے اسکارٹ کے تاریخی ناول''طلسمان'' کا مطالعہ کیا تو ان پر گہرا اثر پڑا۔ان کا تاثر یہ تھا کہ اس میں اسلام کا مذاق اڑایا گیا ہے چنانچہ شرر نے ردعمل کے طور پر ناول لکھنے شروع کیے۔ان کا پہلا ناول''ملک العزیز ورجینا'' تھا۔ان کے ناولوں کا مقصد اسلام کی عظمت اور سربلندی دکھا کرامت مسلمہ کو بیدار کرنا تھا۔ان کا نقطہ نظر اصلاحی تھا۔ شرر کے تاریخی ناولوں میں''فردوسِ بریں'' کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں''منصور موہنا''''عزیز مصر''،''فلورا فلورنڈا''،''فتح اندلس''،''زوالِ بغداد''''ایام عرب'' وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے معاشرتی ناول بھی لکھے ہیں۔جن میں''بدرالنساء کی مصیبت''اور''آغا صادق کی شادی'' قابل ذکر ہیں۔تشکیلی دور کے ان اولین ناول نگاروں کی تخلیق کا یہ اثر ہوا کہ ناول کے قارئین کی تعداد بڑھتی گئی اور ناول نگاروں میں بھی اضافہ ہوا۔منشی سجاد حسین، محمد علی طبیب، قاری سرفراز عربی اور دوسرے کئی ناول نگاروں نے اس جدید صنف کو ترقی دینے کی کوشش کی۔

ان ناول نگاروں کے بعد اہم ترین نام مرزا ہادی رسوا کا ہے۔انہوں نے تقریباً پانچ ناول لکھے۔''افشائے راز''،''اختری بیگم''،''ذات شریف''،''شریف زادہ''اور''امراؤ جان ادا''۔ان تمام ناولوں میں فنی طور پر بہترین تخلیق ''امراؤ جان ادا'' ہے۔ بظاہر تو یہ ایک طوائف کی داستان ہے۔مگر حقیقتاً اس میں لکھنؤ کی انحطاط پذیر تہذیب و معاشرت کا جیتا جاگتا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔رسوا نے اس ناول کے ذریعے فن وفکر کے بہترین امتزاج کو پیش کیا ہے

۱۔ڈاکٹر احسن فاروقی اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ص:۱۳۰

اور ناول کے صنفی معیار کو نئی روایتوں سے آشنا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا رسوا کا یہ ناول اردو ناول کے کلاسیکی سرمائے میں امتیازی درجہ رکھتا ہے۔

اسی دور میں مولانا راشد الخیری کے ناول بھی منظر عام پر آئے۔ انہوں نے بھی عورت کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے ناولوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اہم ناولوں میں ''حیات صالح''، ''بنت الوقت''، ''شام زندگی''، ''شب زندگی''، ''آمنہ کا لال'' قابل ذکر ہیں۔

راشد الخیری کے ہم عصر مرزا محمد سعید نے بھی بہت سے ناول لکھے جن میں ''خواب ہستی''، اور ''یاسمین'' بہت مقبول ہوئے۔ اس دور کے دیگر اہم ناولوں میں محمد علی کا ''عبرت''، حسن سرور کا ''دیوی'' فیاض علی کا ''شمیم اور انور''، محمد صدی تسکین کے ''برف کی دیوی'' اور ''مستانہ عاشق''، پنڈت کرشن پرشاد کول کے ''شاما'' اور ''بیوہ'' نیاز فتح پوری کے ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''ایک شاعر کا انجام''۔ آغا حشر دہلوی کا ''ہیرے کی کنی'' علی عباس حسینی کا ''حلیم بانا'' جیسے ناول شامل ہیں۔ لیکن اس دور کے ناول بحیثیت مجموعی کوئی اپنی راہ نہ نکال سکے اور نہ ہی کوئی امتیازی درجہ حاصل کر سکے۔

بیسویں صدی کے پہلے دہے میں اردو ناول نگاری عہد نو کے فنی وفکری تقاضوں سے آشنا ہوئی۔ اسی دور میں پریم چند اردو ناول کے میدان میں آئے۔ ان کے اہم ناولوں میں ''اسرارِ معابدہ''، ''جلوہ ایثار''، ''بیوہ''، ''بازار حسن''، ''گوشہ عافیت''، ''نرملا''، ''غبن''، ''چوگان ہستی''، ''پردہ مجاز''، ''میدان عمل'' اور ''گئو دان'' شامل ہیں۔ ان تمام ناولوں میں انھوں نے ہندوستان کی عوامی اور معاشرتی زندگی کو پیش کیا۔ ان کے ناولوں کے اہم موضوعات پس ماندہ طبقوں کی محرومیاں، زمین دار، سرمایہ دار، برطانوی حکام کے مظالم، بے روزگاروں کے مسائل، سیاسی جماعتوں کی سازشیں اور فرسودہ رسم ورواج سے پیدا ہونے والی گمراہیاں ہیں۔ ناول نگار کی حیثیت سے پریم چند کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے طبقہ شرفاء کے بجائے عوامی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا۔ پریم چند کے ناولوں میں معاشرتی زندگی کی بہتر تبدیلیاں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ اسی تبدیلی سے اصلاحی شعور کی آئینہ داری ممکن ہوتی ہے۔ ان کے جذبہ اصلاح میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے۔ ان کا بہترین ناول ''گئو دان'' ہے۔

پریم چند کے علاوہ اور بھی کئی ترقی پسندوں نے ناول تحریر کیے جن میں قاضی عبدالغفار کے ناول ''لیلیٰ کے خطوط''، ''مجنوں ڈائری''، ''سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات''، ''انصار زیدی کے ناول ''وحشی''، ''گھر ہستی''، ''سلمیٰ''۔ نجم الدین شکیب کا ناول ''یہ دنیا''، کرشن چندر کے ناول ''شکست''، ''جب کھیت جاگے''''غدار''''طوفان کی کلیاں'' ضیا سرحدی کا ناول ''تسخیر بنگال''، منشی رام پوری کا ناول ''شیطان اور آخری فیصلہ'' اور رئیس احمد جعفری کے ناول ''طوفان'' اور ''بازاری'' اور عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر''، ''معصومہ'' اور ''سودائی شامل ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم کے دوران برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اور ہندوستان میں مفاد پرست ٹولے کے فسادات کے باعث ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ اور اس موقع پر مفاد پرستوں اور نو دولتیوں کا ایک ایسا طبقہ ابھر آیا جس کا نہ ماضی سے تعلق تھا اور جس کے پاس نہ تہذیبی اقدار تھیں۔ اسی دور میں منافقت اور انسانی فطرت کا جو مظاہرہ کیا گیا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان میں رہنے والوں نے ہندو تہذیب کے نام پر مسلمانوں کا اور پاکستان میں رہنے والوں نے اسلام کے نام پر ہندوؤں کا جی بھر کر خون بہایا۔ ان ہنگامہ پرور حالات سے ناول کا فن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور زیادہ تر ناول نگاروں نے ان حالات و واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

اس لیے ۱۹۵۰ء۔ ۱۹۴۷ء کے بعد زیادہ تر ناول فسادات کے موضوع پر لکھے گئے۔ جس میں زیادہ تر ناول جذباتی نوعیت کے تھے جو اپنا معیاری تاثر نہ دے سکے۔ ان ناولوں میں رامانند ساگر کا ناول ''انسان مر گیا'' رشید اختر کا ''پندرہ اگست''، نسیم حجازی کا ''خاک و خون''، ''رئیس احمد جعفری کا ''مجاہد''، قیس رام پوری کا ''خون بے آبرو'' اور ''قدرت اللہ شہاب کا ناول ''یا خدا'' قابل ذکر ہیں۔

پاکستان کی آزادی کے بعد کچھ ایسے ناول لکھے گئے۔ جن کا غالب رجحان اپنی تاریخ کو پیش کرنا تھا۔ اس سلسلے میں نسیم حجازی کا نام نمایاں ہے۔ ان کے تمام ناول اسی مقصد کے پیش نظر لکھے گئے۔ ان کے ناولوں میں ''سو سال بعد''، ''داستانِ مجاہد''، ''محمد بن قاسم''، ''آخری چٹان''، '' شاہین''، ''خاک و خون''، ''یوسف بن تاشفین'' ''آخری معرکہ'' اور ''قیصر و کسریٰ'' اہم ہیں۔ ایم۔ اسلم کا ''زوال الحمراء'' کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ یہ ناول اگرچہ تاریخی ہیں لیکن ان میں عصری زندگی کی سچائیاں نہیں ملتی بلکہ اس کی جگہ کھوکھلی جذباتیت ملتی ہے۔ اس لیے

یہ ناول زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

آزادی کے بعد جن ناول نگاروں نے نام کمایا اور جنہوں نے اردو ناول کو پہچان دی۔ ان میں قراۃ العین حیدر، عزیز احمد اور احسن فاروقی کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ تینوں ناول نگار اپنے ناولوں میں مجموعی طور پر زندگی کو سمجھنے کی سعی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور جو تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کا بغور مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ہمیں ایک دور کے مٹنے اور تہذیب کے ختم ہونے کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ ان ناولوں میں فسادات (جو تقسیم ہند کے نتیجے میں آئے) کو براہ راست موضوع نہیں بنایا گیا۔ اگر فسادات کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ مجموعی تبدیلی اور زندگی کی رفتار کا جزو ہے۔ وہ زندگی کی تبدیلی اور زندگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کا تاثر بھی شدید ہے۔ ان کے ناولوں میں جذباتیت کی جگہ فکر انگیزی ملتی ہے۔ یہ بدلتے ہوئے سماج کا بے حد سنجیدہ اور منطقی مطالعہ ہے۔ ان ناولوں میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کا عمل ملتا ہے اور جاتی ہوئی دنیا کو دیکھ کر آگے بڑھنے کا طریقہ کار اور جذبہ بھی ملتا ہے۔

قراۃ العین کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' سفینہ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخری شب کے ہمسفر'' بہت مقبول ہوئے۔ ''میرے بھی صنم خانے'' میں ہندوستان کی تقسیم کا المیہ ہے۔ جس کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا اور ایسے تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کو ختم کیا گیا جو صدیوں کے اتحاد اور باہمی رشتے سے پیدا ہوا تھا۔ دوسرا ناول ''سفینہ غم دل'' ایک سوانحی ناول ہے۔ جس میں شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ لیکن قراۃ العین کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا ناول ''آگ کا دریا'' ہے۔ اس ناول میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ ورق، ورق پر اپنا سینہ کھولتی ہے۔ اس ناول میں انہوں نے برصغیر کی ڈھائی ہزار کی ثقافت پیش کرنے کے لیے شعور کی رو کی تکنیک کو بہترین انداز میں استعمال کیا ہے۔

عزیز احمد کے ناول ''گریز''، ''ایسی بلندی ایسی پستی''، ''شبنم''، ''اردو ناول کی ارتقاء میں ایک اہم قدم ہیں۔

> ''ایسی بلندی ایسی پستی میں عزیز احمد کا فن بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے غالباً یہ
> اردو کا پہلا ناول ہے جس میں کردار نگاری کے مخصوص پامال راہوں سے
> گریز کر کے مصنف نے نیا راستہ بنانے کی سعی کی ہے۔''(۱)

ا۔ کے۔ کے کھلر   اردو ناول کا نگار خانہ   ص: ۹۱-۹۲

ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناولوں میں ''شامِ اودھ'' ''رہ رسم آشنائی'' اور سنگم کو بہت پذیرائی ملی۔ خاص کر ان کا ناول ''شام اودھ'' بہت ہی مقبول ہوا۔ جس میں لکھنو کی تہذیب کو مٹتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ان ناول نگاروں کے علاوہ بھی چند ناول نگاروں اور ان کے اہم ناولوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ ان میں شوکت صدیقی کا ناول ''خدا کی بستی'' بھی اہم ہے۔ جس میں کراچی کے انڈرورلڈ کو پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان ناول ''کوکا بیلی'' میں لکھنؤ کے جاگیرداروں کی توہم پرستی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

ممتاز مفتی کا ناول ''علی پور کا ایلی'' اس دور کے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے ایلی کے پردے میں بہت حد تک اپنی داستان حیات سنائی ہے۔ اس ناول میں نفسیاتی پیچیدگیوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس ناول میں گاؤں سے لے کر شہر، شہر سے لے کر فلم اور فلم سے لے کر بازارِ حسن تک کی زندگی کو دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اسی دور میں خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' بھی شامل ہے۔ جسے بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ناول میں انہوں نے تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے مسلمان گھرانوں کے حالات کو موضوع بنایا ہے۔

اسی دور کا ایک اہم اور بڑا نام عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' ہے۔ اس ناول میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند کے حالات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ دور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء پر محیط ہے۔ چونکہ یہ ناول ہمارا موضوع ہے اس لیے اس پر مزید بحث اگلے ابواب میں ملاحظہ ہو۔

بہرحال یہ بات قابل اطمینان ہے کہ اس مدت میں اردو ناول نے فن و فکر کے اعتبار سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور اس میں بہر کیف اضافہ ہو رہا ہے۔

باب دوم

''اداس نسلیں فنی نقطہ نظر سے''

۱) اداس نسلیں کی تکنیک

۲) پلاٹ

۳) کردار نگاری

۴) منظر نگاری

۵) زبان اسلوب

عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' اردو ناولوں میں اپنی طرز کا منفرد ناول ہے۔ یہ ناول پہلی بار ۱۹۶۳ء میں منظرعام پر آیا۔ اور ۲۰۰۰ء میں عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' کو انگریزی زبان میں "The weary Generation" کے نام سے ترجمہ کر کے پیش کیا۔ اس ناول میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل بھی جلوہ گر ہوئے ہیں۔ یہ اپنے دور کا ایسا اہم ناول ہے جس میں اس عہد کے حالات و واقعات سے متاثر افراد کو مکمل نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جنھوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے کر ۱۹۴۷ء تک کے عرصے میں برصغیر میں جنم لیا۔ اس ناول کا آغاز ویسے تو ۱۹۱۳ء سے ہوتا ہے لیکن اس میں پس منظر کے طور پر ۱۸۵۷ء کے حالات اور انگریزوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں کو دکھایا گیا ہے۔ اس ناول میں برصغیر کے پیچیدہ تر معاشی حالات اور غیر منقسم ہندوستان کے ایک بڑے ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ بقول اسلم آزاد:

> ''اداس نسلیں پہلا ناول ہے جس میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک برطانوی سامراج کی سیاسی ریشہ دوانیوں، تحریک آزادی کے مرحلوں اور اس تحریک میں کسان مزدور طبقے کے حصے اور حیثیت کو پنجاب کے کسان کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند نے شاید اپنے طبقاتی تعلق، تحریک آزادی میں متوسط طبقے کے کردار اور قربانیوں پر زور دیا گیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس جدوجہد میں سب سے بڑھ کر زیادہ ہلاکت، تباہی اور تاراجی محنت کش انسانوں کا مقدر رہی ہے۔ عبداللہ حسین تاریخی

شعور نے اس پہلو پر زور دے کر ناول کو حقیقت نگاری اور فن و حسن کی نئی
اقدار سے روشناس کر دیا ہے۔''   (۱)

۱) اداس نسلیں کی تکنیک :۔

اس ناول میں عبداللہ حسین نے ورجینا وولف کی طرح ''شعور کی رو'' کی تکنیک برتی ہے۔ اردو ناول میں اس جدید تکنیک کو سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اپنے ناول ''لندن کی ایک رات'' میں استعمال کیا۔ اس کے بعد قراۃ العین اور احسن فاروقی نے اپنے ناولوں میں اس تکنیک کو برتا۔ ان کے علاوہ اس جدید تکنیک کو عبداللہ حسین نے اپنے اس ناول ''اداس نسلیں'' میں کسی حد تک برتا ہے۔ یہ بڑی مبہم اور پیچیدہ تکنیک ہے۔ اس تکنیک کے بارے میں پروفیسر عبدالسلام لکھتے ہیں:

''شعور کی رو والی تکنیک حقیقت نگاری کی ایک ارتقائی صورت ہے۔ اسے
برتنے سے پہلے یہ لازمی ہے کہ اسے برتنے والا اس سے پہلے کی منزلوں
سے گزر چکا ہو۔''   (۲)

''شعور کی رو'' سے پہلے مغربی ناول میں فطرت نگاری کا انداز مروج تھا۔ مغربی ناول نگار اس مقام تک تدریجی ارتقاء کے ذریعے پہنچا۔ اسے برتنے والے ناول نگاروں نے اسے حقیقت نگاری کی موزوں ترین صورت سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ فطرت نگار زیادہ تر خارجی عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس برخلاف ''شعور کی رو'' والے ناول نگار صرف اپنے کردار کی نفسی زندگی سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ فطرت نگاری انسان کا خارجی عمل نہیں ہے بلکہ اس کی نفسی خواہشات ہیں۔ جن کے زیر اثر خارجی عمل وجود میں آتا ہے۔

''شعور کی رو'' نفسیات کا ایک نیا تصور پیش کرتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ انسانی شعور ایک سیال چیز ہے جو بغیر کسی منطقی ربط کے زندگی بھر ہر لمحہ چلتا رہتا ہے۔ شعور سے مطلب یہاں محض حافظہ ذہن، منطقی قوت، الہامی طاقت، تخیل یا اس قسم کی وہ تمام دماغی قوتیں ہیں۔ جو پرانے علم نفسیات میں اہم سمجھی جاتی تھیں۔ اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ دراصل خیالات کا بہاؤ، دریا کے بہاؤ کی طرح ہوتا ہے۔ اس لیے ذہنی خیالات کے بہاؤ کو ''شعور کی رو'' ہی

۱۔ ڈاکٹر اسلم آزاد   اردو ناول آزادی کے بعد   ص:۲۲۹

کہنا چاہیے اور نفسیاتی اصطلاح کے اعتبار سے ہر شخص کے ذہن میں خیالات اور احساسات کا دھارا برابر جاری رہتا ہے۔ چاہے ذہنی کیفیات بدلتی رہیں۔ مگر بہاؤ کا تسلسل قائم رہتا ہے۔ اس تکنیک میں کرداروں کو متعارف کرانے کا انداز جدگانہ ہوتا ہے اوران کرداروں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ناول بھی آگے بڑھتا ہے۔ ایسے ناولوں میں زندگی کے کسی خاص واقعے کو پیش کر کے خیالات کے بہاؤ سے کردار ابھارے جاتے ہیں۔ ایسے ناولوں میں انسان کی داخلی زندگی کی پیشکش بہت ضروری ہے۔ ساتھ ساتھ وقت کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ شعور کے بہاؤ کے ذریعے ماضی کی یادیں، حال کی عکاسی اور مستقبل کے خوابوں کی جھلک بیک وقت پیش کر دی جاتی ہے۔

شعور کی رو کو پیش کرنے کا کوئی مخصوص طریقہ نہیں ہے۔ مختلف مصنفین نے اس کے مختلف طریقے آزمائے ہیں۔ ان میں چار بہت اہم ہیں۔

۱) بلاوسطہ داخلی کلام

۲) بالواسطہ داخلی کلام

۳) ہمہ بین اور ہمہ دان مصنف کا بیان

۴) خود کلامی

بلاواسطہ داخلی کلام ''شعور کی رو'' کو پیش کرنے کا اہم ترین اور ترقی یافتہ طریقہ ہے۔ بلاواسطہ کلام صیغہ واحد متکلم میں ہوتا ہے۔ اس طریقہ کے مطابق کردار اپنا ذہن خود پیش کرتا ہے۔ مصنف اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ نہ کوئی تشریح پیش کرتا ہے اور نہ کسی وضاحت کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ یہ خیالات نجی ہوتے ہیں اور مصنف کو بعض اوقات ایسے اشارے دینے پڑتے ہیں جن سے خیالات سمجھ میں آسکیں۔ یہ مداخلت زیادہ نظر نہ آنے والی حد تک ہونی چاہیے۔

بالواسطہ داخلی کلام میں ناول نگار ہمہ بین و ہمہ دان مصنف کا روپ دھار کر اپنے کردار کی ماقبل تکلم کیفیات کو پیش کرتا ہے اسے صیغہ واحد غائب میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں ناول نگار جہاں جہاں ضروری سمجھتا ہے تشریحی اشارے بھی دیتا ہے۔ ''شعور کی رو'' کے ناولوں میں خود کلامی کو برتنے والے اس میں داخلی کلام کی آمیزش بھی کر لیتے

ہیں۔

''شعور کی رو'' والے ناول کی امتیازی خصوصیت اس کا تصور زمان ہے۔قدیم ناول میں اگر کسی کردار کے واقعات زندگی بیان کرنے مقصود ہوتے تھے۔یا اگر کہیں حسبِ ضرورت حال میں ماضی کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔تو واضح الفاظ میں اس وقت کا تعین کر دیا جاتا تھا۔لیکن ''شعور کر رو'' والے ناولوں میں ذہن گھڑی والے وقت کا تابع نہیں ہوتا۔اس کا ایک نظام وقت ہے۔اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔

عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' ایک تاریخی ناول ہے جس میں ''شعور کی رو'' کے ذریعے روشن پور کے نعیم کی تہذیب کی داستان سنائی گئی ہے۔ اب تک تاریخی ناول لکھنے کا وہی پرانا طریقہ رائج تھا۔ جس کا آغاز سر والٹر اسکاٹ نے کیا تھا۔

ورجینا وولف نے یہ نیا طریقہ ایجاد کیا کہ ایک کردار کو اپنی قوم کی نمایاں صفات کا حامل بنا کر اسے قوم کی تاریخ میں سفر کرتا ہوا دکھایا ہے۔ ورجینا وولف کا ناول ''اورلینڈ'' عہد الزبتھ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۲۸ء تک انگریزی تاریخ کے مخصوص رجحانات کو کردار کے عمل کے ذریعے پیش کرتا ہے۔

جبکہ ''اداس نسلیں'' میں ہندوستان کی تاریخ تہذیب اور معاشرت کے ساتھ سیاسی واقعات کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ناول کے واقعات کا پھیلاؤ ۱۹۱۳ء سے کر ۱۹۴۷ء تک ہیں۔اس ناول کا دائرہ نسلوں کی تاریخ و تہذیب کے جذباتی اور فکری تار و پود کا محض وظیفہ ہی نہیں۔اس المیے کا تصویری خاکہ بھی ہے جو سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی زوال و ارتقاء سے ہم آمیزی کرتا ہے۔محاکات کے ذریعے عبداللہ حسین نعیم کے کردار کو پیش منظر میں رکھ کر پس منظر کے مختلف وجودوں اور مختلف تضادات کے حوالے سے معاشرتی تضادات کو وضع کر کے زندگی کی ہمہ گیریت میں المیے کی نشان دہی کی ہے۔اس بارے میں اسلم آزاد اپنی کتاب میں دیوندر اسر کے الفاظ یوں کوڈ کرتے ہیں:

> ''اداس نسلیں ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم دور ۴۷-۱۹۱۳ء کو پیش کرتی ہے اس میں تواریخ، واقعات اور کرداروں کی پیچ در پیچ ساخت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور یہ سب کچھ ایک مربوط ڈھانچے میں منتقل ہو گئے ہیں۔

ناول میں زبانی، جذبات واحساسات، مسرتوں اورخوشیوں، ناکامیوں اور
نامرادیوں ، خوابوں اور خوف کو بڑے جاندار طریقے سے پیش کیا گیا
ہے۔''اداس نسلیں'' ہمارے دور کی بے چینی اور ذہنی کرب کو قاری تک منتقل
کرنے میں کامیاب ہے۔''(۱)

اس ناول میں دیہات کی سخت کوش زندگی، لاحاصل جنگ آزادی، سیاسی جلسے جلوس، دہشت گردوں کی تنظیم، کانگرس میں شمولیت، سوئی ہوئی قوم کی بیداری جس کے نتیجے میں آزادی کا حصول ممکن ہوا۔ انسان جان و مال کی ارزانی، مسلم لیگ کی سرگرمیاں، محبت کے تصورات اور بٹوارہ کی وجہ سے نعیم کے تجربوں کی دنیا تخلیق ہوتی ہے۔ اور انہی حوالوں سے عبداللہ حسین نے عصری زندگی کے بعض اہم مسائل اور حیات انسانی پر ان کے تصرفات کی معنویت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اس ناول میں موضوعاتی جہات میں گرے فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ ایک نئی جہت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جس سے فکری شخصیت میں حقیقت اور غیر حقیقت کی مسمار ہوتی حدود اسے ایک بے معنی سرحد پر لے آتی ہیں۔ داخلی طور پر بے بسی، مایوسی اور جبریت کا گہرا احساس ذات کے الم ناک شعور کی شکل میں بیمار روحوں اور محنتی جسموں والے تنہا افسردہ لوگوں کو پیش کرتا ہے۔

۲) پلاٹ:۔

''اداس نسلیں'' اپنے پلاٹ اور فلسفے کے حوالے سے بہت بڑا ناول ہے۔ ۶۴۶ صفحات پر مشتمل یہ ناول اپنے اندر زمان ومکان کے لحاظ سے بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ اس میں ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ ناول نگار نے تخیل، ذہانت اور حافظہ کے عناصر سے کام لیتے ہوئے ناول کے واقعات اور تجربات کو محسوسات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ یہ ناول چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ روشن محل کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ روشن پور سے، تیسرا حصہ جنگ عظیم اور چوتھا حصہ تقسیم ہند کے واقعات سے شروع ہو کر پاکستان آخر ختم ہوتا ہے۔ مصنف نے کرداروں کی مدد سے چاروں حصوں کو مربوط کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ حصے مل کر ایک ''اجتماعی کل'' کی شکل اختیار نہیں کر پاتے۔

۱۔اسلم آزاد　　　اردو ناول آزادی کے بعد　　　ص:۲۲۹

''اداس نسلیں'' کا پلاٹ اگرچہ غیر منظّم ہے۔ تاہم اس میں تواریخ، واقعات اور کرداروں کے پیچ در پیچ ساخت کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے اور اس طرح داخلی سطح پر یہ سب کچھ کسی قدر ایک مربوط انداز میں سامنے آتا ہے۔ اس میں جذبات، احساسات، ناکامیوں اور نامرادیوں، خوابوں اور خوف کو مختلف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور ایک مخصوص دور کی بے چینی اور ذہنی کرب کسی نہ کسی طرح قاری تک پہنچایا۔ اس کے علاوہ ''اداس نسلیں'' کا کینوس اور پلاٹ وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں بعض خامیاں در آئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر اسلم آزاد کے نزدیک:

> ''پڑھنے والوں کے سامنے مختلف علاقوں کے دلکش مناظر تو سامنے آجاتے ہیں اور قارئین کی دنیا کے تجربات بھی معلومات کی نئی روشنیوں سے منور ہوجاتی ہے۔ مگر ناول کے قصے کا فطری اور بے ساختہ بہاؤ برقرار نہیں رہ پاتا۔ واقعات جب ایک سے دوسرے ماحول میں منتقل ہوتے ہیں تو حالانکہ ناول نگار اپنے بیانات سے ان کا تسلسل بنا کے رکھنا چاہتا ہے لیکن یہ ہو نہیں پاتا اور ان کا جوڑ نمایاں ہوجاتا ہے۔'' (۱)

ناول پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چاروں حصوں میں مرکزیت کس حصہ کو حاصل ہے۔ اس کا تعین کرنے میں زیادہ غور وفکر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس لیے کہ کہانی کہیں بھی سفر کیوں نہ کر رہی ہو مصنف اپنے مخصوص منصوبے کے تحت روشن پور کا حوالہ دے کر اسے مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیہاتی زندگی پر تقریباً سوا سو صفحے صرف کیے گئے ہیں۔ کم وبیش اتنے ہی صفحے روشن محل کی زندگی سے متعلق ہیں۔ روشن محل کا روشن پور سے یہ تعلق ہے کہ اس گاؤں کا زمیندار یعنی مالک یہاں رہتا ہے۔ مصنف کے نزدیک شاید یہ تعلق کافی نہیں تھا اس لیے انھوں نے روشن محل کی عذرا سے نعیم کی شادی کرادی۔ لیکن طبقاتی فرق ان کے رشتے میں برابر نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ اس مقام پر ذہن میں یہ خیال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اگر مقصد دیہاتی زندگی کی پیشکش تھی تو اس قدر تفصیل کے ساتھ روشن محل، پھر جنگ آزادی، فیکٹری مزدوروں کی زندگی، سیاست، جلیانوالہ باغ کا واقعہ اور پرنس آف ویلز کا دورہ، مظاہرے وغیرہ کو اس قدر پھیلاؤ کے ساتھ پیش کرنے کی کیا

۱۔ ڈاکٹر اسلم آزاد   اردو ناول آزادی کے بعد   ص: ۲۴۱

ضرورت تھی۔اس کے علاوہ روشن پور چونکہ پنجاب اور دلی کی سرحد پر واقع ہے اس لیے وہ اس زمیندار کو دلی سے زیادہ دور نہیں لے جاسکتے تھے۔دلی اور لکھنؤ کی تہذیب میں فرق تھا مگر اس کی نشاندہی عبداللہ حسین کے لیے ممکن نہ تھی۔اس لیے انھوں نے لکھنؤ کے نواب کو ہی روشن محل میں لا بٹھایا۔

اس ناول میں بہت سے اقساط ایسے ہیں جو پورے طور پر قصہ کا جز نہیں بن پائے۔اور پیوند کی طرح اوپر سے چپکائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سیاست کو ہی لے لیجیے۔اس عہد کے تقریباً ہر ناول میں آزادی کی جدوجہد کی تصویر پیش کی گئی ہے اس لیے عبداللہ حسین بھی اسے ضروری سمجھتے ہیں۔مگر اس سیاسی جدوجہد کا ناول کے کرداروں سے وابستہ ہونا ضروری تھا۔یہ سیاسی پس منظر بالکل اسی قسم کا ہے جیسے ہمارے بعض ''تنقید نگار'' شعراء کے حالات کے سلسلے میں عنوان بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔سیاسی پس منظر یقیناً اہم ہوتا ہے مگر اس اثر کا معنی خیز ہونا ضروری ہے۔

سیاسی جدوجہد کی حیثیت تاریخی ہے سیاسی اجتماعات کا ذکر کیا جائے میں اس دور کی اہم ہستیوں کی شمولیت ظاہر کی جائے تو ایسے مقام کا اور کسی کے گھر میں ہوں تو ایسی ہستی کا انتخاب ضروری ہے جن کا ذکر اس عہد کی تاریخ میں ملتا ہو۔اپنی بیسنٹ کو کھلے جیسے لوگوں کے جمع ہونے کے لیے روشن محل کا انتخاب کیا گیا ہے۔روشن آغا زمیندار ہیں۔اس دور کے زمیندار کا اتنا باہمت ہونا کہ اس پایہ کے سیاسی لوگ اس کے خاص دوستوں میں شامل ہوں۔قرین قیاس نہیں لگتا۔

اس طرح جب نعیم زخمی ہو کر جنگ سے واپس آجاتا ہے تو تقریباً ۱۹۱۵ء کا زمانہ ہے سیاسی جدوجہد کے نقطہ نظر سے یہ دور بڑا اہم ہے نعیم اس ناول کا ہیرو ہے اس لیے اسے جدوجہد میں شامل کرنا مصنف ضروری سمجھتے ہیں۔تا کہ نعیم کا قد و قامت بڑھے اور اسے روشن محل کی عذرا کے لائق بنایا جائے۔

اس طرح جنگ سے واپسی پر نعیم ماسٹر کے کہنے پر بغیر تفصیلات معلوم کیے فوراً کانگریس میں شامل ہوتا ہے یہ بات عجیب سی لگتی ہے اور پلاٹ میں تضاد پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔اس طرح یہاں تھوڑی سی تربیت دے کر نعیم کو دہشت گردوں کے گروہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔یہ سارا معاملہ کانگریس کی اس زمانے کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں

رکھتا۔ دہشت پسندی اور تخریبی سرگرمیاں کانگریس ہائی کمان کی منصوبہ بندی میں شامل نہیں رہی۔ البتہ (Quit India Movement) کے کاروائیوں میں یونیورسٹی اور کالجوں کے طالب علم حصہ لینے لگے تھے اور انھوں نے واقعی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مگر یہ دوسری جنگ عظیم کی بات ہے ۱۹۱۵ء میں یہ صورت حال نہیں تھی۔

نعیم کو یہ تخریبی سرگرمیاں قطعی پسند نہیں تھیں۔ وہ ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ''شیلا'' نعیم کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ لوگ اس مار دیں گے اس لیے ''شیلا'' موقع پا کر نعیم کو وہاں سے نکال دیتی ہے۔ ماسٹر کو نعیم کا کانگریس کا نمائندہ سمجھتا تھا اس کے بارےمیں اس کے خیالات اچھے تھے۔ پھر ایسے آدمی نے اُسے اُس گروہ تک کیسے پہنچا دیا۔ جس پر اسرار طریقے سے نعیم اس گروہ تک پہنچتا ہے وہ سیاسی جماعتوں کا طریق کار نہیں تھا، تعجب ہے کہ نعیم اس کے بارے میں کچھ نہ سوچا۔ دہشت پسندوں کے گروہ سے لوٹ کر جب وہ گھر پہنچتا ہے تو گویا وہ دو سال گھر سے باہر رہا تھا۔ مگر اس دوران میں اس کی جو مصروفیات قصے میں بیان کی گئی ہیں وہ تین مہینے سے زیادہ کی نہیں ہیں۔

اس طرح جلیانوالہ باغ کے واقعے کے بارے میں راوی نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ حد درجے احمقانہ لگتا ہے کہ کانگرس کے اہم نمائندے اتنے بڑے واقعے کی تفصیلات ایک مچھلی والے سے راستے میں بیٹھ کر سنتے ہیں۔

اس طرح اسی زمانہ میں مسلم لیگ بھی ابھر کر سامنے آچکی تھی اس ناول میں مسلم لیگ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دلی میں مسلم جماعتوں کا ایک اجتماع ہوتا ہے۔ یہاں مسلم لیگ کی دونوں جماعتیں تھیں جن کے سربراہ محمد علی جناح اور سر محمد شفیع تھے۔ خلافت کمیٹی کے ارکان بھی موجود تھے۔ جس میں مولانا شوکت علی بھی تھی۔ جمعیت العلماء کے نمائندوں میں مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ شبیر احمد عثمانی بھی تھے۔ ان کے ساتھ مسلمان امراء بھی تھے۔ خواتین کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ جلسہ میں نعیم اور عذرا بھی آئے تھے۔ جلسے کی صدارت آغا خان کر رہے تھے اس جلسے میں سر شفیع نے پنجاب مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ میں مدغم کرنے کا اعلان کیا تو گویا اب پوری مسلم لیگ کی قیادت قائداعظم کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس جلسہ کی کاروائی کا جو نقشہ پیش کیا گیا۔ اس سے انتشار اور تنظیم کے فقدان کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ ہندوستان میں کیا کر رہی تھی۔ اُس جلسے کی

کاروائی کو ادھورا چھوڑ کر مصنف لکھتے ہیں:

''اسی سال چھ اپریل کو ڈنڈی ساحل پر مہاتما گاندھی نے نمک سازی کا
قانون توڑ کر سول نافرمانی کا آغاز کیا۔''(۱)

محض قانون شکنی کی خاطر لوگ نمک بناتے ہیں۔

جلیانوالہ باغ کے واقعہ کے بعد نعیم کا دیہات میں جانا اور مسلم لیگ کے جلسہ میں شریک ہونا تو قرین قیاس لگتا ہے مگر اس کے بعد وہ یکا یک سیاست کو چھوڑ کر پشاور کی طرف چل پڑتا ہے۔ کانگرس کے کام کی خاطر نہیں بلکہ محض اس لیے کہ اس نے اپنی جنگ کے زخمی ساتھی ''امیر خان'' سے ملنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ وعدہ اسے یکا یک یاد آ گیا ہے۔ پلاٹ میں خامی کا باعث بنتا ہے۔

نعیم کو یہاں بھجوانے کا مقصد اس کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا کہ مصنف نے مصنوعی طریقے سے کینوس کو پھیلایا ہے اس بہانے قبائلی علاقے کی ایک شادی کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے رسم و رواج قبائلی طور طریقے، ان کی جہالت، ان کی محبت، ان کی مہمان نوازی، ان کا خٹک رقص اور رقص کے ساتھ ساتھ لڑائی وغیرہ غرضیکہ بظاہر ایک دلچسپ تصویر پیش کی جاتی ہے۔ یہاں شاید مصنف کو خیال آیا ہو کہ نعیم تو گلے گلے سیاست میں اتر چکا ہے۔ چنانچہ پشاور ہی میں وہ ایک سیاسی پلیٹ فارم بھی لگا دیتے ہیں۔ سول نافرمانی کی تحریک یہاں بھی زور پکڑ لیتی ہے۔ نمک بنایا جاتا ہے۔ کھدر پوش لیڈروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ فائرنگ ہوتی ہے لوگ مارے جاتے ہیں۔ نعیم اسے بھی تماشہ کی طرح دیکھتا ہے۔ وہ یہاں کے کسی لیڈر سے نہیں ملتا۔ اس واقعہ سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہو پاتا۔ اس ظلم و ستم کی تصویر پیش کرنے کے بعد اس قصہ کو یہیں چھوڑا جاتا ہے۔

ناول کے پلاٹ اور پھیلاؤ کے بارے میں عبدالسلام یوں لکھتے ہیں:

ناول کی ہیئت اور اس کے Pattern سے ممکن ہے آپ کا ذہن ''فسانہ
آزاد'' کی طرف منتقل ہو۔ ''فسانہ آزاد'' کا منشا بھی اپنے ہیرو کے کارنامے
بیان کرنا ہے اس میں جادو کے کرشمے نہیں ہیں پھر بھی اس کا ہیرو ہرفن مولا

۱۔ اداس نسلیں　　　　　ص: ۳۲۵

ہے وہ ترکی کی طرف سے جنگ بھی لڑتا ہے کیا نعیم میں آزاد کی جھلک نظر نہیں آتی ۔عبداللہ حسین بھی اسے ہرفن مولا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں کوئی ''حسن آراء'' نعیم کو جنگ پر نہیں بھیجتی مگر مصنف اسے ایک اچھا سپاہی بھی ضرور ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بہادری کے کارناموں پر اسے بہادری کا سب سے بڑا انعام یعنی وکٹوریہ کراس ملتا ہے اور وہ ایک بازو گنوا کر گھر لوٹتا ہے۔ پھر بھی مصنف اس کی جان نہیں چھوڑتے۔اس ایک بازو والے انسان کو بھی'' آزاد'' کی طرح مہمات پر بھیجتے ہیں۔ اسے سوؤروں کے شکار پر بھی لے جاتے ہیں۔ یہاں وہ خفت آمیز بہادری کا نمونہ پیش کرتا ہے اگر وہ شکار پر نہ جاتا تو قصہ میں کیا کمی رہ جاتی۔ یہاں بھی اس واقعے کی وجہ سے کینوس کو وسعت دینا ہے۔''(۱)

مصنف نعیم کو اہم سیاسی ہستی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسے گرفتار کرانا بھی ضروری تھا۔اسے جاٹ نگر میں ایک جلسہ منعقد کرنے کے سلسلے میں دہلی سے ہدایات موصول ہوتی ہیں۔اس سول نافرمانی کی پاداش میں اُسے گرفتار کرلیا جاتا ہے اور جیل بھیج دیا جاتا ہے۔اس بہانے جیل کی اندرونی دنیا کا نقشہ بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

اس زمانے میں عذرا سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں حصہ لیتی ہے نعیم تو اس پر فخر محسوس کرتا ہے مگر اس کے گھر کے سارے لوگ انتہائی خفگی کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے انتہائی سردمہری سے پیش آتے ہیں۔ روشن آغا نے نعیم کی گرفتاری اور عذرا کے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر جس قسم کے تاثر کا اظہار کیا تھا اس کی روشنی میں یہ قطعی خلاف قیاس ہے کہ وہ ''کوکھلے'' اور ڈاکٹر ''امبیدکر'' جیسے لوگوں کے ریزولیوشن میں شریک ہوسکیں۔

پلاٹ کی ان خامیوں کے باوجود اسلم آزاد کے نزدیک ''اداس نسلیں'' کی اہم صفات یہ ہیں:

''برطانوی غلامی کے پرآشوب دور نے ستم زدہ، اعصابی طور پر مضمحل اور

۱۔ڈاکٹر عبدالسلام — ہمارا اردو ناول منزل بہ منزل — ص:۲۲۱

۲۔اسلم آزاد — اردو ناول آزادی کے بعد — ص:۲۳۵

یاس بھری ہوئی جو نسلیں پیدا کیں۔ عبداللہ حسین نے ان واقعوں کے
ذریعے ان کا نہایت اہم خاکہ پیش کیا ہے اور عبداللہ حسین کے غیر جذباتی
نقطہ نظر نے ان واقعوں اور ان سے متعلق جذباتی پس منظر کی اہمیت کو بہت
بڑھادی ہے۔(۱)

کردارنگاری:۔

کردارنگاری کے لحاظ سے ''اداس نسلیں'' میں بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ واقعات کی مناسبت سے لاتعداد کردار سامنے آتے ہیں۔ اور اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد چلے جاتے ہیں۔ ان کرداروں میں ایسے کردار بھی ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک قدم قدم پر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے نہ صرف ایک دوسرے کے قدموں، بلکہ قدموں کی آہٹیں بھی سنتے ہیں۔لیکن آہٹوں کی اس معیت میں بھی ہر کردار اپنی جگہ تنہا اور بے یارومددگار دکھائی دیتا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار ''نعیم'' اور ''عذرا'' ہیں۔ ''نعیم'' اور ''عذرا'' دراصل ایک دوسرے کو مکمل کرنے کا ذریعہ ہیں۔لیکن ان میں یہ خوبی برائے نام ملتی ہیں۔

ضمنی اور اہم کرداروں میں عذرا کے والد روشن آغا، نعیم کے والد نیاز بیگ، نعیم کا سوتیلا بھائی علی، علی کی بیوی عائشہ، عذرا کی بہن نجمی، دہشت گردوں سے وابستہ رہنے والی شیلا۔ روشن پور کا کسان مہندرسنگھ، ڈاکٹر انصاری، پرویز، مسعود اور پارلیمنٹری سیکرٹری انیس الرحمٰن کے کردار کے علاوہ اس ناول میں بہت سے ایسے کردار جو کہروں کی طرح ابھرتے ہیں اور پھر خود بخود منظر سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ان کرداروں میں کارخانوں کے مزدوروں، دہشت گردوں ،جلیانوالہ باغ کے بوڑھے، کسانوں، جنگ میں شامل ہونے والے ہندوستانی فوجیوں، تاریخی اور سیاسی شخصیات کے کردار ہیں۔ جو ناول میں واقعات کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اور پھر اپنا اپنا رول ادا کر کے خود بخود نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔

''اداس نسلیں'' کا بنیادی اور مرکزی کردار نعیم کا ہے اور یہی وہ کردار ہے جس کے اردگرد ساری کہانی گھومتی اور مختلف رخ اختیار کرتی ہے۔نعیم روشن پور کے ایک کسان نیاز بیگ کا بیٹا ہے۔لیکن وہ دیہاتی ماحول سے دور اپنے

چچا ایاز بیگ کا بیٹا ہے۔لیکن وہ دیہاتی ماحول سے دور اپنے چچا ایاز بیگ کے پاس پرورش پاتا ہےاور تعلیم حاصل کرتا ہے۔اس کے باوجود اس کی جڑیں شہری تہذیب میں نہیں بلکہ اس کے ذہن اور روح کی جڑیں دیہات میں پیوست ہیں اور وہیں سے غذا بھی حاصل کرتا ہے لیکن دیہات سے نکلنے کا خواہش مند بھی رہتا ہے۔ایک معنی میں وہ اپنے اس ماحول میں وسعت پیدا کرنے کی غیر شعوری کوشش کرتا ہے۔وہ چچا کے ساتھ روشن محل کی ایک تقریب میں آتا ہے اور یہاں رہنے والوں کے تہذیبی اور سماجی پس منظر سے متاثر ہو جاتا ہے،اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی اس ماحول کا حصہ ہے۔روشن آغا کی بیٹی عذرا اس کے دل میں ہلچل پیدا کرتی ہے لیکن وہ اس طبقاتی فرق کو مٹا نہیں سکتا جوان دونوں کے درمیان حائل ہے اس لیے وہ واپس گاؤں لوٹ آتا ہے۔اس کی زندگی کا کوئی مقصد واضح نہیں۔وہ ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جسے اپنی منزل کا علم نہیں۔حالات اسے جہاں لے جاتے ہیں وہ بغیر کسی مزاحمت کے اس طرف چل نکلتا ہے۔شہر سے روشن پور آ کر وہ کھیتی باڑی کے طریقے سیکھتا ہے۔اسی دوران نعیم کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں کسی قدر سکون اور خوشی آ گئی ہے لیکن اندر کی بے چینی اسے یہاں بھی قرار نہیں لینے دیتی اس لیے وہ خود انگریز سارجنٹ کے پاس جا کر فوج میں بھرتی ہونے کا کہتا ہے:

> ''میں محاذ پر جاؤں گا''
>
> سارجنٹ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔تم اس کے لیے موزوں نہیں ہو۔ پتلے چہرے والے افسر قریب آ کر کھڑا ہوا۔نعیم نے غیر یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔اور شدید اندرونی خواہش کے زیر اثر بولا:''میں سواری کر سکتا ہوں۔رائفل چلا سکتا ہوں۔ان سب سے بہتر لڑ سکتا ہوں۔''(۱)

نعیم فوج میں بھرتی ہو کر محاذِ جنگ پر چلا جاتا ہے۔اس جنگ میں ہونے والی قتل و غارت گری اُس پر شدید اثرات مرتب کرتی ہے۔اور وہ نفسیاتی طور پر ایسی سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ کسی دوسرے انسان کی ذرا سی خوشی کو بھی برداشت نہیں کر سکتا اور اس کا نتیجہ اٹھا کر داس کی موت کی صورت میں نکلتا ہے:

۱۔اداس نسلیں ص:۷۸۔۷۹

’’خندق سے صرف دو لمحے کا فاصلہ تھا۔نعیم نے بڑھنا چاہا لیکن جلتی ہوئی نفرت کا جذبہ غالب آ گیا۔‘‘

’’نعیم تم زخمی ہو؟ وہ خاموش پڑا رہا۔ٹھاکر داس اچک کر باہر نکلا اور اس کی طرف دوڑا۔گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔ٹھاکر داس کے دونوں پاؤں زمین سے اٹھ گئے اور وہ ہوا میں ایک لمبی جست لے کر زمین پر گرا اور لوٹتا ہوا زور سے اس کے ساتھ آ ٹکرایا۔‘‘(۱)

یہ جنگ نعیم کے لیے بے حسی کے جذبات لاتی ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہی بے حسی اسے خون کے اس سمندر سے بچا کر واپس لاتی ہے ورنہ اگر وہ بھی مہندر سنگھ کی طرح اس جنگ کو اسی شدت سے اپنے اندر محسوس کرتا تو اسے احساس کی موت کے ساتھ روح کی موت کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔وہ اس جنگ سے تھک ضرور جاتا ہے اور اس کے ذہن میں انتشار کی کیفیت بھی اسی سے جنم لیتی ہے لیکن اس جنگ میں اس کی ملاقات ایک جرمن فوجی سے ہوتی ہے جس کی نعیم مدد کرتا ہے اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے وہ اس کے لیے لکڑی کا ہاتھ بناتا ہے جو نعیم کے ساتھ تمام عمر رہتا ہے۔ان دونوں کے درمیان دوستی پیدا ہوتی ہے جو اس مکالمے سے واضح ہوتا ہے:

’’اور بولا: دوستی خاموشی اور محنت میں پرورش پاتی ہے۔باتیں ہم بازاروں اور دکانوں میں کرتے ہیں۔‘‘

’’تم میرے دوست ہو؟ نعیم نے مسکرا کر کہا۔‘‘

’’میں سمجھتا ہوں۔‘‘

مگر ہم تو دشمن ہیں۔ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

’’نہیں‘‘ وہ جھکا جھکا بولا، میں یہ سب نہیں سمجھتا۔کیا فرق پڑتا ہے، وہ سب میدانِ جنگ میں تھا۔ یہاں تم نے میرے اوپر احسان کیا ہے میں نے تمہارے لیے محنت کی ہے۔ہم دونوں دوست ہیں۔‘‘(۲)

۱۔اداس نسلیں ص:۱۲۱

۲۔ایضاً ص:۱۴۲

جنگ سے واپس آنے کے بعد نعیم گاؤں والوں کے لیے ہیرو بن جاتا ہے کیونکہ جنگ میں اُسے وکٹوریہ کراس بطور انعام ملتا ہے۔ کراس حاصل کرنے کے بعد اس کی معاشی حیثیت مستحکم ہو جاتی ہے اور گاؤں والے ان کے خاندان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس دوران روشن آغا کی بیٹی عذرا جس نے نعیم کو طعنہ دیا ہوتا ہے وہ اپنی خالہ کے ساتھ نعیم سے ملنے آتی ہے اور محبت کا اظہار کرتی ہے۔ نعیم بھی اسے چاہتا ہے اُس کی اندرونی بے چینی اُسے اتنی خوشیاں حاصل کرنے کے بعد بھی پر سکون نہیں رہنے دیتی۔ اس لیے وہ دہشت گردوں کے ایک گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن جلد ہی ان کے نظریات سے اکتا جاتا ہے۔ ان دہشت گردوں کا مقصد بھی آزادی کا حصول ہے مگر وہ اس کے لیے غلط راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ نعیم ان کو مشورہ دیتا ہے:

> ''تم لڑائی کا ڈھنگ نہیں جانتے۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی بڑا دماغ بھی چاہیے۔ چند لوگوں کی دہشت پسندی سے کیا ہوگا؟ اس جنگ میں ہم بھی اتنے ہی شریک ہیں جتنے تم''۔۔۔ ایک گاڑی اڑانے سے تم کیا کر لو گے؟ ہندوستان میں ہزاروں ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ آزادی کے لیے ریل گاڑیوں سے نہیں، ان میں سفر کرنے والوں لاکھوں لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایک پروگرام چاہیے ایک ضابطہ۔'' (۱)

لیکن دہشت گرد اس کی باتوں سے متفق نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان میں ایسے لوگ شامل ہیں جو جاگیرداروں اور زمینداروں کے مظالم سے تنگ آ کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اسی گروہ میں نعیم کی ملاقات شیلا سے ہوتی ہے جو ایک اچھوت لڑکی ہے۔ نعیم کے دل میں اس کے لیے محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس سے جنسی اختلاط شروع کرتا ہے اور یہی تجربہ بالآخر اس کے ضمیر کا بوجھ بن جاتا ہے۔ اس بوجھ تلے وہ آخر دم تک دبا رہتا ہے۔ اس خاص مقام پر تو وہ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن آخر عمر میں جب وہ خود احتسابی سے گزرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس جرم کا مرتکب سمجھتا ہے۔ پہلی مرتبہ شیلا سے ارتکاب گناہ کے بعد نعیم نے اپنے لیے کچھ اس طرح کا جواز ڈھونڈا

۱۔ اداس نسلیں ص:۱۸۸

ہے:

''سوراخ میں دھوپ کی لکیر کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ کمرہ پار کرتے
ہوئے وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ دھوپ کی لیکر اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔
آتش دان پر پڑے ہوئے شکستہ شیشے میں اُسے اپنا چہرہ نظر آیا: غلیظ اور زرد!
بڑھی ہوئی ڈاڑھی میں اسے اپنے آپ کو پہچاننے میں کافی دقت ہوئی۔
یکبارگی ایک سرکش خیال نے اُس کے دل میں سر اٹھایا،
''ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔ میں اس کا حق دار ہوں۔''
پشیمانی کا سایہ اس کے ذہن سے چھٹ گیا اور اُس نے پہلی دفعہ گزری ہوئی
رات کے سرور کو اپنے اعضاء پر محسوس کیا۔''(۱)

یہی شیلا اسے دہشت گردوں کے گروہ سے نکالتی ہے کیونکہ دہشت پسند نعیم کو قتل کرنا چاہتے ہیں، شیلا بھی اس کے ساتھ دہشت پسندوں کے گروہ سے نکل آتی ہے لیکن نعیم کو اس کو راستہ میں چھوڑ دیتا ہے اور آخری عمر میں نعیم کی ذہنی کشمکش کا ایک سبب یہ واقعہ بھی ہوتا ہے۔

دہشت پسندوں کے گروہ سے آنے کے بعد نعیم کانگرس میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی دوران اس کی شادی آغا کی بیٹی عذرا سے ہو جاتی ہے۔ ان کے درمیان محبت کا جذبہ شادی کی بنیاد بنتا ہے۔ مگر یہ جذبہ اس قدر گہرا نہیں کہ یہ ان کی زندگی کی ساری ضروریات پوری کر سکے۔ جوانی کے جذبات میں جب انسان جسمانی کشش ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کشش اپنے معنی کھونے لگتی ہے اور دو مختلف طبقات، دو مختلف نکتہ نظر کے لوگ اس کشش کی بناء پر کچھ عرصہ تو ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن جب انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ سوائے ایک نکتے کے ان میں کوئی بھی چیز مشترک نہیں تو یہ رشتہ اپنے معانی کھو دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک لمحے نعیم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے تو اس کا ردعمل کچھ یوں ہوتا ہے:

''نعیم کی آنکھیں آپ سے آپ وا ہو گئیں اور وہ بے خیالی سے چھت کو

۱۔ اداس نسلیں ص:۱۸۲

گھورنے لگا۔آہستہ آہستہ اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہوگیا اور نینداس کی
آنکھوں سے ہوا کی طرح غائب ہوگئی۔اس کے سینہ میں ایک بھاری، درد
آلود شئے کلبلائی۔اس نے آہستگی سے اسے چھوئے بغیر، اپنے آپ کو اس کی
گرفت سے آزاد کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔اذیت اور تبدیلی کے اس لمحے میں
اس کے دل میں ساتھ لیٹی ہوئی عورت کے لیے شدید تنفر پیدا ہوا۔‘‘(۱)

نعیم اس دوران ایک اہم دور سے گزرتا ہے یعنی وہ سیاسی جلسے جلوس میں حصہ لے کر ’’پرنس آف ویلز‘‘ کا بائیکاٹ کرتا ہے اور جیل چلا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی کراس کی زمین بھی حکومت ضبط کر لیتی ہے۔اس کے بعد ہندوستان کی سماجی اور سیاسی حالات میں جو افراتفری مچی ہوتی ہے اور جو تبدیلیاں ہورہی ہوتی ہیں وہ نعیم کے فکری شعور کو ایک نیا موڑ دیتی ہیں اور اس میں ہم عذرا کو بھی اس کا ہم خیال دیکھتے ہیں۔جلیانوالہ باغ کا واقعہ، سائمن کمیشن کی ہندوستان آمد، سیاسی پارٹیوں کی تنظیم نو، مسلم لیگ اور خاکسار جیسی تحریکوں کا فروغ پانا، برطانوی سامراج کا ظلم اور سیاسی شعور کی بیداری۔ یہاں صرف سیاسی زندگی اہم نہیں بلکہ یہ دکھانا بھی مقصود ہے کہ کس طرح نعیم کا ذہن اپنے نصب العین کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

اس کے بعد نعیم کانگرس کی طرف سے سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہوکر دوبارہ جیل چلا جاتا ہے، جیل سے رہا ہونے کے بعد نعیم پر گاؤں میں فالج کا حملہ ہوتا ہے، چونکہ جیل جانے سے پہلے نعیم عذرا سے لڑ کر گاؤں چلا جاتا ہے۔اس لیے وہ اس دوران ایک دوسرے سے کوئی رابطہ اور تعلق نہیں رکھتے لیکن جیل سے رہا ہونے کے بعد جب نعیم پر فالج گرنے کی خبر عذرا کو ملتی ہے تو وہ ایک وفا شعار بیوی کی طرح ساری تلخیاں بھول کر نعیم کو گاؤں دیکھنے آتی ہے اور پھر علاج کی خاطر نعیم کو روشن محل لے آتی ہے۔نعیم کی بیماری کا یہ دور اس کے لیے ذہنی تبدیلیاں لاتا ہے اور وہ پہلی مرتبہ زندگی اور اپنے اردگرد کے لوگوں کے متعلق سوچنے لگتا ہے، وہ ان طاقتوں کے متعلق جاننے کی کوشش کرتا ہے جو لوگوں کی زندگیوں پر حکومت کرتی ہیں۔اس کے لیے وہ مطالعے میں ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے لگتا ہے۔لیکن مذہب ،سائنس اور فلسفہ کوئی بھی جب اسے جواب نہیں دے سکتے تو وہ ذہنی انتشار کا شکار ہونے لگتا ہے جو اس کی خود کلامی سے

۱۔اداس نسلیں ص:۳۱۹

ظاہر ہوتا ہے:

''مگر سوال یہ ہے بھائی کہ فائدہ کیا ہوا۔ جب ہمیں اس کا علم نہ تھا کیا ہو گیا تھا؟ ڈاکٹر اور مریض یا میاں اور بیوی کے تعلقات میں خدا کہاں آتا ہے۔ اس سہانی صبح کے حسن کو محسوس کرنے اور اس کے تعریف میں کسی اور چیز کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کیوں خواہ مخواہ ساتھی انسانوں کی قدرتی زندگیوں کے نیچے دیکھنے کی کوشش کریں۔ جب کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں؟'' (۱)

ڈاکٹر انصاری نعیم کو مذہب کا قائل کرنا چاہتا ہے مگر نعیم اس کی باتوں سے متفق نہیں ہوتا۔ اس دوران نعیم انڈیا پارلیمنٹری سیکرٹری کے عہدے پر مامور ہو جاتا ہے یہاں اس کی ملاقات انیس الرحمٰن سے ہوتی ہے جو کہ منفی خیالات رکھنے والا انسان ہے، اُس کے خیالات اِس کو مزید قنوطی بنا دیتے ہیں۔ وہ مذہب اور ایمان کے بغیر زندگی گزارنے کا کہتا ہے:

''جانتے ہو ہم نے خدا کو کیوں ایجاد کیا؟ اپنے آرام کی خاطر۔ کیونکہ ہم سوچنا نہیں چاہتے، اور سچائی کی تلاش میں سوچنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ کیونکہ ہم اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہے۔ ہم احمق ہیں۔ احمق۔'' (۲)

نعیم پہلے نظریے کے نسبت دوسرے نظریے سے ہمدردی کا احساس اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ تیسرا نظریہ نعیم خود اپنے ذہنی الجھنوں پر فتح پانے کے لیے ایجاد کرتا ہے۔ اس کا نظریہ عالمگیر محبت کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ذہنی انتشار برقرار رہتا ہے۔ اس دوران نعیم ایک دن اپنے دفتر کے سامنے آزادی کے ہونے والے جلوس میں شامل ہو جاتا ہے اور آزادی کے پروانوں کے ساتھ آزادی کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے ایک قافلے میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس قافلے میں اُسے اپنا سوتیلا بھائی علی نظر آتا ہے جو اس کی سخت گیری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے شہر بھاگ جاتا ہے۔ نعیم اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ نعیم اسے سمجھاتا ہے کہ

۱۔ اداس نسلیں ص:۴۰۶

۲۔ اداس نسلیں ص:۴۵۹

زندگی کو کسی مقصد کے تحت گزارنا چاہیے۔ قدرت اور فطرت کے ماحول میں حصہ لے کر خود کو ہنر مند بنائے اور اپنے ہنر کو جو اس نے اپنے اباؤاجداد سے حاصل کیا ہے ایک امانت سمجھ کر اسے اگلی نسل کو سونپے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارا ورثہ وہ جڑیں ہیں جو زمین پر کھڑا رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ یہ باتیں علی کو سمجھانے کے بعد وہ آخر میں بلوائی کے حملے کا شکار ہو جاتا ہے۔

''اداس نسلیں'' کی تقریباً ساری کہانی نعیم کے کردار کے اردگرد گھومتی ہے یہ کردار اپنے اندر بہت گہرائی لیے ہوئے ہے۔ اس کی نفسیاتی ساخت بہت پیچیدہ ہے۔ جس کی ایک وجہ وہ حالات و واقعات ہیں جو اُس وقت ہندوستان کا مقدر تھے، ایسے دکھوں اور صدموں کے دور میں ایسی ہی نسلیں جنم لیتی ہیں، ایسی نسلیں جو اپنی ذات میں گم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کردار وجودیت کے نظریے سے متاثر بھی نظر آتا ہے کیونکہ ساری عمر دکھ برداشت کرتا ہے اور اس کا خاتمہ بھی المیے پر ہوتا ہے۔ بعض نقادین کا کہنا ہے کہ نعیم کا کردار تمام وسعت کے ساتھ زندہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایک ہیولہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ اعتراض کسی حد تک درست بھی ہے لیکن اعتراض کرنے سے پہلے اُس دور کے حالات پر غور کرنا چاہیے۔ ایسے حالات و واقعات تاریخ اور سیاست کے ایسے ادوار میں زندگی بسر کرنے والے کردار ایسے ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ تہہ دامن رہتے ہیں۔ ان کی پہلی منزل انتشار سے شروع اور آخری منزل انتشار پر ختم ہوتی ہے۔

ناول کا دوسرا اہم اور مرکزی کردار عذرا کا ہے۔ عذرا روشن آغا کی بیٹی اور نعیم کی بیوی ہے۔ ناول میں اس کو ہیروئین کا درجہ حاصل ہے۔ نعیم اور عذرا کا ماحول بالکل متضاد ہے۔ نعیم روشن پور کے ایک کسان کا بیٹا ہے وہ اپنے چچا کے توسط سے تعلیم حاصل کرتا ہے اس کے بعد وہ دیہات آجاتا ہے اور وہاں مطمئن زندگی گزارنے لگتا ہے جبکہ عذرا روشن محل میں پیدا ہوئی۔ اور وہ ایک جاگیردار کی بیٹی ہے، عذرا اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے۔ دعوتیں اور بے مقصد گفتگو اس کی زندگی کا حصہ ہے نعیم جب اسے ملتا ہے تو وہ ایک نوعمر لڑکا ہوتا ہے۔ جس کا کوئی مستقبل نہیں۔ اس کا باپ جیل میں ہے اس کی زمین بھی کم ہے اور اُسے سرکاری نوکری بھی نہیں مل سکتی۔ اس لیے عذرا اُسے اُس کی کم مائیگی کا طعنہ دیتی ہے۔ لیکن جب نعیم بازو کٹوا کر سینے پر کراس سجا کر جنگ سے واپس آتا ہے تو عذرا کے دل میں اس کے لیے شدید محبت کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے طبقے کی روایات کے خلاف نعیم سے شادی کر لیتی ہے۔ اگرچہ اس میں

شک نہیں کہ اس دوران وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اس لیے عذرا شادی کے بعد نعیم کے ساتھ روشن پور چلی جاتی ہے لیکن کچھ عرصے بعد وہ گاؤں کی زندگی سے اکتا جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی جڑیں شہری تہذیب میں پیوست ہیں، اس لیے وہ روشن محل میں رہنے کی خواہش مند ہے۔ جہاں رنگ ہے، روشنی ہے، اور دولت ہے۔ اس کی بے چینی کو راوی نے کچھ یوں ظاہر کیا ہے:

''ہریالی اور سکوں کے اُس لمحے میں اگر کسی جاندار کے دل میں بے چینی تھی
تو وہ عذرا تھی۔''(۱)

نعیم کے دل میں وطن کے لیے محبت ہے اور وہ اس بارے میں سوچتا بھی ہے جبکہ عذرا کسی نظریے کے تحت نہیں بلکہ شہرت کی خاطر سیاست میں قدم رکھتی ہے۔ نعیم عذرا کے کہنے پر سیاست میں آگے بڑھتا ہے اور وہ کانگریس کا ممبر ہونے کی وجہ سے امرتسر کے انکوائری کمیشن میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں اسے محسوس ہوتا ہے کہ عذرا کو ملکی مفادات سے کوئی سروکار نہیں اور نہ ہی جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعے سے۔ اُسے صرف اپنی شہرت کی فکر ہے۔ امرتسر جاتے وقت وہ نعیم سے کچھ یوں کہتی ہے:

''چلو چلیں۔ عذرا بولی۔

کہاں؟

''امرتسر۔ دونوں! ہیں، نعیم؟

عذرا یہ زندگی آسان نہیں ہے تم نہیں جانتیں۔

''لیکن اتنی دلچسپ ہے اس بار دلی گئی تو ڈیسائی سسٹرز نے بدیشی مال کی دکانوں پر پکٹنگ کی تھی۔ ان کی تصویریں سارے بڑے اخباروں اور رسالوں میں چھپیں اور جہاں بھی میں گئی انہیں کا تذکرہ رہا۔ ہر موقع پر، ہر پارٹی میں۔''(۲)

اُس کے اِس رویہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا مقصد سیاست میں صرف اور صرف شہرت حاصل کرنا ہے وہ

۱۔ اداس نسلیں ص:۲۳۴

۲۔ اداس نسلیں ص:۲۳۶

چاہتی ہے کہ وہ جہاں بھی جائے اس کی پزیرائی ہو اور اُس کو سراہا جائے۔ اس کی تصاویر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوں۔

اسی طرح جب ''پرنس آف ویلز'' ہندوستان کا دورہ کرتا ہے تو عذرا کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ پرنس آف ویلز ملے۔ لیکن یہ سن کر اُسے شدید مایوسی ہوتی ہے کہ کانگرس اس دورے کا بائیکاٹ کر رہی ہے تو اس کے ذہن میں یہ تجویز آتی ہے کہ وہ کانگرس کے اس بائیکاٹ میں شامل ہو کر مظاہرہ کریں گے۔ کیونکہ وہ پرنس آف ویلز کو ہر قیمت پر دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عذرا کو نعیم کے کام اور ملکی مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تو صرف بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کی خواہش مند ہے۔ کلکتہ میں پرنس آف ویلز کے خلاف مظاہرے کے دوران جب وہ پرنس کو دیکھتی ہے تو اُس کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے:

> ''وہ شہزادے پر نظر جمائے کھڑی رہی۔ نعیم اس کا بازو ہلا کر نیچی آواز میں چیخا:
>
> ''نکالو''
>
> ''ایں''؟ وہ سوئی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم نے بورڈ اتار لیا؟''
>
> ''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔''
>
> ''نعیم نے بورڈ اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا جو اس نے ہاتھ لٹکائے لٹکائے پکڑ لیا اور شہزادے پر نظریں ہٹائے بغیر، سحر زدہ سی، کھڑی رہی۔''(۱)

عذرا پرنس آف ویلز کو دیکھتی ہے تو اس کی شان و شوکت میں اس قدر محو ہو جاتی ہے کہ اپنی ساڑھی سے وہ کاغذ نکالنا بھول جاتی ہے جس پر احتجاجی نعرہ لکھا ہوتا ہے۔ اِسی طرح وہ مسلم لیگ کے جلسے میں محض سر آغا خان کو دیکھنے کے لیے شرکت کرتی ہے۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عذرا کا کوئی خاص نظریہ نہیں بلکہ وہ سیاست میں صرف نمائش کے لیے دلچسپی لیتی ہے۔ ملکی مفادات سے نہ اس کو اور نہ اس طبقے کے دوسرے افراد کو کوئی دلچسپی ہے۔ عذرا یہ بھی نہیں چاہتی کہ نعیم جیل چلا جائے کیوں کہ اس طرح ان کی کراس کی زمین چلی جائیگی۔ ان تمام خامیوں کے ساتھ عذرا میں

۱۔ اداس نسلیں ص: ۲۶۶

کچھ خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔مثلاً وہ ایک مشرقی عورت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ نعیم سے شادی کرنے کے بعداس کے ساتھ گاؤں چلی جاتی ہےاورایک وفا شعار بیوی کی طرح گاؤں میں اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگتی ہے۔اس کے دل میں روشن محل کی زندگی کے لیے محبت ضرور ہےمگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتی۔اس طرح نعیم جب عذرا کو روشن محل میں کئی مرتبہ چھوڑ کر چلا جاتا ہےاوراس سے لاتعلق رہتا ہےلیکن عذرا کے دل میں اس کے لیے اُسی طرح محبت رہتی ہےاور اِسی لاتعلقی کے دوران جب نعیم پر فالج کا حملہ ہوتا ہےتو وہ اپنی تمام تر رنجشیں بھلا کر اس کے پاس گاؤں آ جاتی ہےاور پھراس کے بہتر علاج کی خاطر اسے روشن محل لے آتی ہے۔اس کی مکمل صحت یابی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔اور جب عذرا کو یہ احساس ہوتا ہے کہ روشن محل والے اس کے شوہر کی عزت نہیں کرتے تو اس کا رویہ شدید ہو جاتا ہے:

> ’’تم نہیں سمجھتے ، وہ ہمیں اپنے آپ میں نہیں جانتے۔وہ جب تمہیں دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تم پر ترس کھا رہے ہیں، کہ وہ کسی بات پر پچھتا رہے ہیں۔وہ ہمیں ناپسند کرتے ہیں۔تم نے دیکھا وہ کس قدر احتیاط کے ساتھ،کس قدر اخلاق سے تمہاری خیرت پوچھتے ہیں۔کیسے کمینے پن کے احساس برتری کے ساتھ، غیر معمولی نرمی کے ساتھ، جیسے ان کو سکھایا گیا ہے۔‘‘(۱)

عذرا اُن مشرقی عورتوں میں سے ہے جو ایک مرتبہ کسی پر فریفتہ ہو جائیں تو پھر اس سے ساری عمر محبت کرتی رہتی ہیں اُس پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں اوراس کی زندگی میں پھر کسی دوسرے مرد کی گنجائش نہیں رہتی۔

اس کے علاوہ اگر وہ ملکی مفادات اور حالات سے دلچسپی نہیں تو اس میں صرف اس کا قصور نہیں بلکہ یہ تو سارے ہندوستان کے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ کا حال تھا۔تاہم اس کے باوجود وہ اپنے شوہر کی خاطر جب وہ جیل میں تھا تو سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کرتی ہے۔آخر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلی آتی ہےاور نعیم کی

۱۔اداس نسلیں ص:۴۲۵

یادوں کے سہارے باقی زندگی گزار دیتی ہے۔

ناول نگار نے عذرا کی کردار سازی میں نفسیاتی پیچیدگیوں اور الجھنوں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور اس کو ایک زندہ کردار بنا دیا ہے۔ جس میں زندگی کی جھلک اور وہ عام رویہ بھی ہے جو کسی ایسے فرد کا ہو سکتا ہے جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔

نعیم اور عذرا کے مرکزی کرداروں کے متوازی نعیم کے سوتیلے بھائی علی اور اس کی بیوی عائشہ کے کردار نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں گاؤں کے پرسکون اور پُر فضا ماحول میں پل کر جوان ہوئے یہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اس لیے ان کے مزاج میں گاؤں کے باشندوں کی طرح روایتی سادگی اور معصومیت کے عناصر موجود ہیں۔ تعلیم کی سخت گیری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے علی گاؤں سے بھاگ کر شہر میں جا بستا ہے۔ شہر میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد کسی فیکٹری میں مزدور بن جاتا ہے۔ اور شہر کی ایک مزدور بستی میں کرائے کا مکان لے کر عائشہ کو گاؤں سے بلا لیتا ہے۔ یہ مکان تنگ اور تاریک کوٹھری کی طرح ہے۔ اس کوٹھری میں وہ انتہائی عسرت کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ایک فیکٹری ملازم کی اجرت اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ اس میں بمشکل جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکے۔ فیکٹری کا ظالمانہ ڈسپلن اور کمر توڑ محنت علی کی زندہ اور توانا شخصیت کو مسخ کر دیتی ہے اور عائشہ مستقل مریضہ بن جاتی ہے۔ گاؤں کا وہ کھلنڈرا اور خوش مزاج نوجوان مشینی زندگی سے چڑ چڑا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مشینی زندگی فرد میں اداسی کو جنم دیتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ انسان کی روح موت کا شکار ہونے لگتی ہے اس طرح انسان ذہنی اور جسمانی طور پر ناآسودہ رہتا ہے۔ علی اسی طبقہ کا فرد ہے جس کے ذریعے عبداللہ حسین نے ہندوستانی معاشرے میں ہونے والی صنعتی ترقی اور مزدور کے استحصال کی بھرپور جھلک دکھائی ہے:

> ''گھر پہنچ کر علی نے کھانا کھایا اور عائشہ کو ہر دم بک بک کرتے رہنے پر پیٹا۔
> تو اس کے دل پر موت کا سایہ گہرا ہو گیا۔ صبح سویرے کام پر جاتے ہوئے
> اُسے عجیب احساس ہوا۔ وہی گلیاں، مکان، نل، وہی فیکٹری، مشینیں،
> دیواریں، وہی جگہ، وہی منظر، وہی لوگ جن سے ہر روز ملتا تھا، ہر چیز، ہر

شے اس قدر حوصلہ شکن طور پر یکساں اور ساکن اور غیر مبدل۔ دفعتاً اس جگہ کی تنگی اور خوفناک حد بندی کا احساس بوجھ بن کر اس کے دل پر بیٹھنے لگا۔''(۱)

فیکٹری کی کمر توڑ محنت، تفریح کے ذرائع کا فقدان اور معاشی تنگ دستی علی کو زندگی اور معاشرے سے اس حد تک بددل کر دیتی ہے کہ وہ سب سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ فیکٹری کی ہڑتال کے دنوں میں اس کی زندگی میں عارضی تبدیلی آتی ہے وہ ان مزدروں میں شامل ہو جاتا ہے جو ہڑتال میں حصہ لینا نہیں چاہتے۔ چنانچہ مل مالکان اس سے ہمدردی کا سلوک کرتے ہیں۔ انھیں انعامات دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ مل مالکان اور انتظامیہ فیکٹری کو ہر صورت میں چلانا چاہتے ہیں۔ تا کہ ہڑتال جلد نا کام ہو سکے۔ دوسری طرف ہڑتال میں شامل مزدور پولیس کے تشدید کا نشانہ بنتے ہیں۔ علی کی یہ خوشی بھی چند روزہ ثابت ہوتی ہے اور پھر وہی بدحالی اس کا مقدر ہوتی ہے۔

علی مشینی زندگی سے دور بھاگنا چاہتا ہے لیکن اُسے سمجھ نہیں آتا کہ وہ کہاں جائے۔ اسی کشمکش میں وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ جاتا ہے:

''وہ کئی گھنٹے تک ریل کے اسٹیشن پر آتے جاتے مسافروں، ریل گاڑیوں اور گڈ مڈ ہوتی ہوئی لائنوں کو دیکھتا پھرا۔ آخر تنگ آ خر شمال کی طرف جانے والی ایک ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔''(۲)

اسی کشمکش میں مبتلا وہ ایک ریل گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔

''سارا راستہ وہ ڈبے میں بیٹھا رہا۔ راستے میں کئی بار لوگوں نے کسان جان کر اُسے نشست سے نیچے دھکیل دیا اور خواہ مخواہ جھگڑا کرنے لگے اور دور کے مسافر سے بھگوڑا سمجھ کر حقارت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کرتے رہے لیکن وہ خاموش بیٹھا اپنے دل میں تازہ تازہ حاصل کردہ آزادی کے خوف کو پالتا رہا۔ یہاں تک کہ قریب تیس گھنٹے کے سفر کے

۱۔ اداس نسلیں ص:۳۸۱۔۳۸۲

۲۔ اداس نسلیں ص:۳۸۲

بعد ایک بڑے سے ڈھکے ہوئے سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی خالی ہونا شروع ہوئی۔''(۱)

علی جب لاہور پہنچتا ہے تو وہاں ہنگامہ برپا ہوتا ہے چنانچہ انگریز سپاہی اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔لیکن ایک عورت بانو اُس کی جان بچاتی ہے۔علی نے اپنے بھائی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فوج میں بھی بھرتی ہوجاتا ہے لیکن دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کی وجہ سے محاذ پر جانے میں ناکام رہتا ہے۔وہ آزادی کی جدوجہد میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔اس کے علاوہ چونکہ وہ کسان کا بیٹا اور کسان ہے جس کی مٹی ہی پیار اور محبت سے گوندھی گئی ہے۔اگرچہ اس کے زندگی کے بیشتر قیمتی سال نعیم کی وجہ سے ضائع ہوجاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ قافلے میں اپنے بھائی سے بارہ سال کے بعد ملتا ہے تو اسے خوش دلی سے قبول کرتا ہے اور جب نعیم بلوائیوں کے حملے میں مارا جاتا ہے تو اسے سخت صدمہ ہوتا ہے۔علی کی بیوی عائشہ بھی ہجرت کی تکالیف سہتے سہتے آخر مر جاتی ہے اور علی پاکستان اکیلا پہنچتا ہے۔یہاں اس کی ملاقات دوبارہ بانو سے ہوتی ہے یہ بانو دراصل شیلا ہوتی ہے جو دہشت گردوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ آخر میں پاکستان کے ایک صنعتی شہر میں یہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر اگر علی اور عائشہ کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو یہ دونوں گاؤں کے سیدھے سادے باشندے ہوتے ہیں جن کی ذات،آلائشوں سے پاک ہوتی ہے۔لیکن جب ان پر مشینی زندگی مسلط کی جاتی ہے تو یہ دونوں ذہنی طور پر بیمار ہوجاتے ہیں۔

اداس نسلیں کا ایک اور اہم کردار روشن آغا کی چھوٹی بیٹی نجمی کا بھی ہے۔یہ عذرا سے بیس سال چھوٹی ہے۔اس کا کردار بھی عذرا کی طرح اونچے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔اور بعض جگہ پر تو عذرا کا روپ معلوم ہوتا ہے۔لیکن اس کے باوجود نجمی اپنی الگ شخصیت رکھتی ہے۔یہ کردار ایسی نسل سے ہے جو تیسری پشت میں آ کر اپنے ماحول اور تہذیب کو خود اپنے اندر اس طرح جذب کر چکی ہے کہ اب یہ ساری خوبیاں اور خامیاں اس کے اردگرد پھیلنے کے بجائے ان کی ذات کا حصہ بن جاتی ہیں۔یہ نسل اپنے سے پہلی نسل کی طرح شہرت کی پرستار نہیں۔اس نسل میں ایک خاص رکھ رکھاؤ پیدا ہو چکا ہے جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔نجمی اسی نسل کی نمائندہ ہے وہ انٹر کی طالبہ اور مصور بھی ہے وہ

۱۔اداس نسلیں ص:۳۸۲

ایک فن کار کی طرح حساس ہے۔ وہ زندگی کے بارے میں سوچتی ہے۔ ان کا نکتہ نظر اپنی بہن عذرا سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے محبت کے نظریے میں گہرائی ہے۔ وہ ہر کسی کو محبت کا اہل نہیں سمجھتی۔ خالد سے باتیں کرتے ہوئے وہ کہتی ہے:

''ہم ہر کسی سے محبت کے اہل نہیں۔ محبت جو سادگی اور سچائی کا تجربہ ہے۔ جب آتا ہے تو ہمیں ذہن کی دنیا سے اوپر لے جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ہم کسی ذہنی یا جسمانی قوت کی مدد سے حاصل نہیں کر سکتے جو روح کی تمام تر قوتیں لے کر آتا ہے۔ جس میں مذہبی راہنما گزرتے ہیں۔ یہ ہمارے مخلص ترین جذبوں میں سے ہے میں۔۔۔ جذبے کا انتظار کرتی ہوں۔''(۱)

وہ ایک ایسا ہمسفر چاہتی ہے جو اس کے خاندانی پس منظر سے متاثر ہو کر اس سے شادی نہ کرنے بلکہ وہ صرف اس سے اس لیے محبت کرے کہ وہ ایک الگ وجود رکھتی ہے۔ وہ اس کی دلچسپیوں کو صرف اس لیے برداشت نہ کرے کہ اس میں اس کی خوشی ہے بلکہ وہ اس کا ہم ذوق ہو۔ مخالف جنس سے نجمی کو بھی بھر پور توجہ حاصل ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک محبت بھرا دل چاہتی ہے جس اسے ساری زندگی چاہے، یہاں نجمی کے الفاظ میں ہمیں مصنف کا نظریۂ محبت نظر آتا ہے:

''ایک نہ ایک انسان ضرور آتا ہے، ہمیشہ، ہر جگہ، جو ہمیں محبت کی سچائی کا یقین دلاتا ہے۔ جس کو دیکھتے ہی ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی ہے جس کو پہچان کر ہم دل میں کہتے ہیں: ''مجھے پتا تھا تم آؤ گے۔ مجھے تمہارا انتظار تھا۔ دیکھو، یہ میں ہوں، مجھے جانتے ہو؟'' اور ہمیں دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں پرانی شناسائی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہنستا ہے اور اس کی ہنسی ہمیں زندگی کی معصومیت کا یقین دلاتی ہے، وہ کبھی نہیں کہتا کہ وہ محبت کرتا ہے لیکن اپنی

۱۔ اداس نسلیں ص: ۴۲۰

آنکھوں میں محبت کے دیوٹ لیے پھرتا ہے۔''(۱)

نجمی کے کردار کی وجہ سے مصنف نے اس ناول میں کسی حد تک رومانوی پہلو لانے کی کوشش کی ہے۔ خالد کے لیے نجمی کے دل میں نرم جذبات کی کیفیت کو مصنف نے کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے:

''نجمی آنکھیں پھیلائے اسے دیکھتی رہی۔ خالد کی آنکھوں میں بے پایاں نرمی اور اداسی دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں نوعمری کے جذبات چمکے۔ جنہوں نے اسے پریشان کر دیا۔ نوعمر، کنوارے جذبات جو محبت کرنے والے انسان کے خلوص اور سچائی کا یقین دلاتے ہیں۔ جو محبت کے خالص تصوراتی جذبے کو پہلی دفعہ اپنے سامنے پا کر ٹھٹک جاتے ہیں اور روئیں روئیں میں بے ساختگی پیدا کر دیتے ہیں۔''(۲)

یہ اس کردار کا المیہ ہے کہ محبت کے بارے میں ایسے نظریات رکھنے کے باوجود اس کو حالات ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے ہیں جس کو نظریاتی طور پر وہ پہلے ہی رد کر چکی ہے۔ مگر بعد میں مجبوراً اسے قبول کر لیتی ہے۔ آخر میں نجمی بھی وجودی نظریے سے متاثر نظر آتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زندگی لا حاصل ہے تمام انسان اتنے دکھ سہنے کے بعد آخر مر جاتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ زندگی کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ یہ تو ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

آخر میں شکست و ریخت کا شکار ہو کر زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی ہے اور مسعود سے محبت نہ کرنے کے باوجود شادی کر لیتی ہے، وہ ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو پر سکون اور مطمئن نہیں ہو سکتا اور اداسی جن کا مقدر ہے،

مسعود، نجمی کے دوستوں میں شامل ہے۔ بعد میں اس کی نجمی سے شادی بھی ہو جاتی ہے اس کا کوئی خاص پس منظر نہیں، بلکہ یہ بھی اُسی چور دروازے سے داخل ہوا ہے جس سے نعیم داخل ہوا تھا۔ مسعود کی بھی خواہش ہے کہ وہ روشن محل کے افراد میں شامل ہو کر اس گھرانے کا ایک فرد بن جائے۔ یہ بھی فوج میں نعیم کی طرح جنگ کا تجربہ حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ نعیم اور مسعود کے درمیان ایک اور بات کسی حد تک مشترک ہے اور یہ کہ دونوں کا مذہب کے بارے میں فلسفہ تقریباً ایک جیسا ہے دونوں، مذہب تک فلسفے کی مدد سے اور تجریدی طور پر نہیں پہنچے۔ بلکہ اپنے گزرے ہوئے

۱۔ اداس نسلیں ص:۴۲۱

۲۔ اداس نسلیں ص:۴۱۸

تجربات کی وجہ سے پہنچے۔مسعود کے کردار کی کمی یہ ہے کہ اس کا تعلق نعیم کی طرح زمین سے نہیں بلکہ شہر کے متوسط طبقے سے ہے، اس لیے اس کے کردار میں گہرائی کا فقدان نظر آتا ہے۔

مسعود اور نجمی کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔لیکن ہجرت کے بعد پاکستان میں دونوں شادی کر لیتے ہیں اور جس طرح نعیم اور عذرا کے درمیان محبت مختلف منزلوں سے گزرتی ہے اسی طرح نجمی اور مسعود میں خاصی تلخی ہونے کے باجود آخر میں یہ دونوں محبت اور رفاقت کے جذبے سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔مسعود عذرا کو سوتے ہوئے دیکھ کر خود سے کچھ یوں ہم کلام ہوتا ہے:

> ''مسعود نے بڑے رحم اور محبت سے اسے دیکھا۔تم بڑے سکون کی نیند سو رہی ہو۔لیکن تم بھی اسی نسل سے تعلق رکھتی ہو۔اور یہ نسل اپنی ذات میں بٹ چکی ہے۔تم نے روح میں پناہ ڈھونڈی ہے مگر میں نے بڑے بنیادی انسانی جذبوں سے زندگی کا سبق سیکھا ہے۔ محبت ، نفرت، خوف، لالچ۔۔۔میں روح میں یقین نہیں رکھتا۔''(۱)

نیاز بیگ ایک حقیقی کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ وہ ایک محنتی اور جفاکش کسان ہے اور ناول کے مرکزی کردار نعیم کا باپ ہے۔ نیاز بیگ کا تعلق مغلوں کی آخری نسل سے ہے۔اس کی دو بیویاں ہیں، ان کی اپنی زمین ہے۔اور روشن آغا سے اچھے تعلقات ہیں۔ نیاز بیگ کو انگریز حکومت کسی جرم میں گرفتار کر کے ان کی جائیداد ضبط کر لیتی ہے۔اس واقعے سے نیاز بیگ کا چھوٹا بھائی آیاز بیگ بددل ہو کر شہر چلا جاتا ہے اور جاتے وقت نیاز بیگ کے بیٹے نعیم کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ نیاز بیگ جیل سے رہائی کے بعد اپنی بچی ہوئی تھوڑی سی زمین پر محنت کرتا ہے۔اُسے اپنے کھیتوں سے محبت ہے۔وہ اپنی دونوں بیویوں کے درمیان بھی برابری کا سلوک کرتا ہے۔وہ اپنے کھیتوں کو لہلہاتے دیکھ کر جھومنے لگتا ہے۔ وہ کبھی بیکار نظر نہیں آتا ہے اور جب نعیم شہر سے آتا ہے تو اُسے بھی کھیتوں میں لے جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان کی جڑیں زمین میں ہیں۔ نیاز بیگ کا کردار ناول میں ایک زندہ اور جیتا جاگتا کردار ہے۔

روشن آغا کا کردار ایک جاگیردار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ یہ روشن پور کا جاگیردار ہے۔گاؤں کے لوگ

۱۔اداس نسلیں ص:۵۵۳

اس کے سامنے آنکھ اُٹھا کر بات نہیں کر سکتے وہ اپنے باپ کی طرح انگریزوں کا وفادار ہے۔ نیاز بیگ کے خاندان سے ان کے اچھے مراسم ہیں کیونکہ روشن آغا کے والد کی نیاز بیگ کے والد سے دوستی تھی۔ یہ گاؤں سے دور دلی میں روشن محل میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ پرانی قدروں کے امین بھی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جب ان کی بیٹی عذرا نعیم سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے تو روشن آغا اس فیصلہ سے بہت خفا ہوتے کیونکہ ان کے خاندان کی دوستی ہونے کے باوجود نعیم کا خاندان ان کے خاندان سے کم حیثیت ہے، روشن آغا کے نزدیک پرانے رسم ورواج بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے ذہن پر مغربی تعلیم وتہذیب کا اثر تو ہے لیکن اس کے اثرات صرف خارجی سطح پر نظر آتے ہیں۔ان کے طرز رہائش اور انداز معاشرت میں تبدیلیاں ضرور ہوتی ہیں مگر ان تبدیلیوں نے ان کے مشرقی مزاج اور روح کو ابھی تک متاثر نہیں کیا۔اس کی ایک جھلک ہمیں تب نظر آتی ہے جب عذرا سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے کے بعد لوٹتی ہیں تو روشن آغا اس سے کچھ یوں پوچھتے ہیں:

> ''آپ لکھنؤ گئی تھی بی بی۔''
>
> ''عذرا نے گونگوں کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔روشن آغا نے چشمہ اتار کر کتاب پر رکھا۔اور ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا۔'' ہم نے سنا آپ نے وہاں کسی ہنگامے میں شرکت کی۔''
>
> ''میں نعیم سے ملنے گئی تھی۔'' عذرا نے یکساں آواز میں کہا۔۔۔''
>
> ''نعیم نے پہلے ہی اپنی حب الوطنی سے ہماری عزت بڑھائی ہے۔ ہمارے خاندان میں پچھلے سو برس سے کسی ایک نے ایسے کام نہ کیے تھے۔'' روشن آغا خفگی اور طنز سے ہنسے۔عذرا اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔''
>
> ''میں نے تمہیں روشن آغا اور روشن محل کا نام برقرار رکھنے کے لیے پرورش کیا تھا۔''
>
> ''روشن آغا اب واضح تلخی سے بولے، آپ سے امیدیں وابستہ کی تھیں۔ یہ

نہیں کہ چھوٹے لوگوں کی طرح آپ ہنگامے اور قانون شکنی کریں۔اب
آپ بھی جیل جاؤ گی۔''(۱)

روشن آغا کی اس گفتگو سے اُن کے کردار پر روشنی پڑتی ہے وہ ایک طرف تو اپنے خاندان کی رسوائی نہیں برداشت کر سکتے اور دوسری طرف اپنے انگریز آقاؤں ،کو خفا نہیں کر سکتے ۔تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان پاکستان ہجرت کرتا ہے مگر وہ اپنے ایک ملازم کے ساتھ روشن محل میں رہ جاتے ہیں۔کیونکہ ان کو یقین ہے کہ انگریز اور ہندوان کے دوست ہیں اور ان کی مدد کریں گے لیکن جب روشن محل پر حملہ ہوتا ہے تو وہ بھی مجبوراً پاکستان ہجرت کرتے ہیں اور یہاں آ کر ایک پرانی حویلی کا نام روشن محل رکھ کر فوت ہو جاتے ہیں۔

ناول کے ضمنی کرداروں میں اہم کردار شیلا کا بھی ہے۔شیلا دہشت گردوں کے گروہ سے وابستہ ہے۔ یہ مدن کی بہن ہے، ان کا تعلق اچھوت ذات سے ہے ۔ یہ زمینداروں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر گاؤں چھوڑ کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد دہشت پسندوں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہے ۔کیونکہ وہ اس نظام فکر سے انتقام لینا چاہتی ہے۔نعیم کے سمجھانے پر شیلا کا بھائی دہشت پسندوں کو ترک کرنے پر راضی ہو جاتا ہے لیکن مدن ایک پولیس مقابلے میں مارا جاتا ہے اور شیلا اکیلی رہ جاتی ہے۔شیلا سے نعیم جنسی اختلاط بھی قائم کرتا ہے۔لیکن شیلا نعیم سے محبت کرنے لگتی ہے۔اور جب اس کو احساس ہوتا ہے کہ دہشت گرد نعیم کو قتل کرنا چاہتے ہیں تو وہ نعیم کو وہاں سے نکالتی ہے اور خود بھی اُس کے ساتھ دہشت گردوں کے گروہ سے نکل آئی ہے لیکن نعیم اُسے بیچ راستے میں چھوڑ دیتا ہے۔نعیم شیلا سے دھوکہ کرتا ہے اور یہی دھوکہ آخر عمر میں اس کے لیے نفسیاتی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔نعیم کے چھوڑنے کے بعد شیلا ایک ہندو کے پاس رہتی ہے پھر ایک مسلمان اس کو اپنا لیتا ہے اس کے بعد وہ لاہور کے ہیرا منڈی پہنچ جاتی ہے۔اور تقسیم ہند کے بعد ایک قافلے میں بہتی ہوئی شیلا جواب بانو کہلاتی ہے پاکستان پہنچتی ہے۔ یہاں اس کی ملاقات نعیم کے بھائی علی سے ہوتی ہے جس کی بیوی ہجرت کی تھکن کی تاب نہ لا کر دم توڑ چکی تھی ۔ چنانچہ علی اور بانو شادی کر لیتے ہیں اور پاکستان میں نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔اُسے علی میں نعیم کی جھلک دکھائی دیتی ہے حالانکہ وہ ان دونوں کے تعلق کو نہیں جانتی۔لیکن پھر بھی علی سے کہتی ہے:

۱۔اداس نسلیں ص:۳۰۳۔۳۰۴

''وہ پہلا شخص تھا جس کے ساتھ مجھے دل سے محبت ہوئی تھی۔مگر چند روز کے
بعد وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔لیکن مجھے اب تک یاد ہے۔ پہلا شخص جسے ہم
دل سے پیار کرتے ہیں۔ہم کبھی نہیں بھولتے ۔ بعد میں آنے والے سب
لوگوں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔۔۔تم بالکل اس کی طرح چلتے
ہو۔''(۱)

شیلا کے کردار سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی کس طرح مجبور ہو کر طوائف بن جاتی ہے۔اُس کے طوائف بننے میں معاشرہ کا کردار مصنف نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

ناول نگار نے کردار پیش کرنے میں مہارت سے کام لیا ہے۔ناول کے تمام کردار اپنے نفسیات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

۴)منظر نگاری:۔

منظر نگاری کو بھی فنی حیثیت سے کسی بھی کہانی میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔''اداس نسلیں'' میں ناول نگار نے مختلف کرداروں اور واقعات کے تجربات کے سلسلے میں جو ماحول پیش کیا ہے وہ یقیناً ناول نگار کی تخلیقی بصیرت اور ذہانت کی عمدہ مثالیں ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ ''اداس نسلیں'' میں عبداللہ حسین نے قدرتی مناظر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔مثلاً

''سورج ہاتھ بھر بھی اُوپر نہیں آیا تھا۔لیکن دن میں دوپہر کی تپش آ چکی تھی۔
صبح کی تازہ ،سبک ہوا کے ساتھ دھوپ کچی ممٹیوں اور بھورے وسیع کھیتوں
پر پھیل چکی تھی۔مٹیالے رنگ کا غبار جو تین روز تک گاؤں میں منڈلاتا رہا
تھا۔بادل اور ہوا کے گزرنے کے ساتھ چھٹ چکا تھا۔''(۲)

جہاں ناول نگار کو دیہات کے ماحول اور منظر کشی میں کمال حاصل ہے اُسی طرح ناول نگار جنگی حالات و واقعات کی بھی اس طرح منظر کشی کرتے ہیں کہ قاری کے نظروں کے سامنے جنگ کا منظر آ جاتا ہے:

۱۔اداس نسلیں ص:۵۳۷

۲۔اداس نسلیں ص:۱۱۴

’’نالیاں اونچی ہوئیں اورخوفناک تڑتراہٹ کے ساتھ گولیوں کی دوسری بوچھاڑنکلی۔اب مٹی عین دشمن خندقوں سے اڑی اور چمکتے ہوئے سیاہ خودوں کی قطار یکلخت غائب ہوگئی۔صرف ایک جگہ سے دو بازو ہوا میں اٹھے اور ایک سپاہی زبردست جھٹکے کے ساتھ خندق سے باہر جا پڑا۔دوسری بوچھاڑ سے وہ دس گز لڑھکتا ہوا چلا گیا اور ہموار زمین پر جا کر گرے ہوئے پائن کے بے جان تنے کی طرح ساکن ہوگیا۔‘‘ (۱)

اس کے علاوہ ناول نگار نے قدرتی مناظر کو بڑی خوبی سے ناول میں سمویا ہے۔اس کی خوبصورت مثال درج ذیل ہے:

’’رات کی مخصوص دھیمی اور مسلسل بارش سارے ہی وقت ہو رہی تھی۔ دریچے کے چھجے پر یوکلپٹس کے پتوں پر، نیچے باغ کے راستوں پر،ترپ، ترپ،ترپ اسکی خاموش آوازوں کی موسیقی سارے میں پھیلی تھی۔ایک ایک بند ہوتے دریچوں پر بجھتے ہوئے شیشوں پر ایک ایک کر کے سوتے ہوئے مردوں اورعورتوں کے کانوں پر بج رہی تھی۔۔۔بالآخر یہ رات غیر نہ تھی۔ بند دریچوں کے باہر ہوتی ہوئی بارش خواب آلود اور پراسرار تھی۔‘‘(۲)

اس طرح فصل کے پک جانے کے بعد کسانوں کے دل میں جوڈر وخوف ہوتا ہے اس کو راوی نے بہت خوبصورت منظر نگاری سے ناول میں کچھ یوں سمویا ہے:

’’وہ ایک ایسی صبح تھی جب بہار کا زور ٹوٹ چکا ہوتا ہےاوردھوپ میں تیزی آجاتی ہے۔جب پتوں کا رنگ سبزے سے گہرا سبز ہو جا تا ہےاورڈالیوں پر موسم بہار کے آخری پھول کھلتے ہیں اور آسمان مٹیالا اور گرم ہونا شروع ہوتا

۱۔اداس نسلیں ص:۱۱۴

۲۔اداس نسلیں ص:۳۷۲-۳۷۱

ہے ۔ جب اوس گرنی بند ہوجاتی ہے اورعورتیں رات کوسونے کے لیے
چھت سے باہرنکل آتی ہیں اورمرد دن بھر درانتیوں کے داندانے بنانے اور
بیلوں کے کُھر صاف کرتے رہتے ہیں اوران کی آنکھوں میں کٹائی سے پہلے
کا خوف سایہ کیے رہتا ہےاور ہونٹوں پر پڑی جمی ہوتی ہے جب دور دور تک
سونے کے رنگ کی تیار فصل گرد کے طوفان میں لہراتی ہے اور چنبیلی کے
پودوں پر گرما کی پہلی کلیاں نمودار ہوتی ہیں۔''(۱)

اس طرح بہت سے خوبصورت مناظر ناول میں موجود ہیں۔ جوناول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتیں ہیں۔اور جس نے ناول میں محاکات کی صورت اختیار کی ہے۔

۵)زبان واسلوب:۔

''اداس نسلیں'' کی زبان سادہ ہےاوراس میں کرداروں کی صلاحیت کے مطابق زبان استعمال کی گئی ہے۔تاہم سب سے زیادہ اعتراضات ہی اس کے زبان پر کیے گئے ہیں۔اعتراض کرنے والوں میں احسن فاروقی پیش پیش ہیں۔ان کے بقول:

''اس کی اس قدر بےڈھنگی زبان کا خیال مجھے رہا۔اور یہ بات کھٹکتی رہی کہ
آخر زبان کے وہ الجھاوے جن کی وجہ سے میں ناول کو نہ پڑھ سکا۔ کیوں
ڈالے گئے ہیں۔ اس ناول کو میں نے اس طرح پڑھنا شروع کیا جیسے
انگریزی زبان کے کم یاب مسودے ریسرچ کے سلسلہ میں پڑھے
تھے۔''(۲)

اس طرح ''اداس نسلیں'' کی زبان پرڈاکٹرحسرت کاسگنجوری کا اعتراض یہ ہے کہ:

''اداس نسلیں'' کی زبان ناقص ہے۔کہیں کہیں بھونڈی بھی۔''(۳)

''اداس نسلیں'' کی زبان پرسہیل بخاری کچھ یوں اعتراض کرتے ہیں:

۱۔اداس نسلیں ص:۲۳۲
۲۔ڈاکٹراحسن فاروقی بشمولہ سیپ کراچی ص:۲۵۷
۳۔ڈاکٹرحسرت کاسگنجوی ادب اوراقدار ص:۳۲۳

''ناول میں زبان اور اسلوبِ بیان کی اتنی زیادہ اور فحش غلطیاں ہیں اور روزمرہ محاورے اور صرف ونحو کے اصولوں کی اس قدر خلاف ورزی کی گئی ہے کہ اس کی مثال ابتداء سے آج تک کسی اردو ناول میں نہیں ملتی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول پہلے پہلے انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کو اردو میں ڈھالتے وقت لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ۔ اس کے ثبوت میں چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

مرکبات: بے آواز شور۔ اکلوتا گھر۔ سرد غصہ

محاورات: گہرا جھینپ گیا۔ جب اس کا سانس برابر ہوا۔

غلط اور مبہم جملے: نعیم نے کھانے پر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایسے دن لمبے لمبے وقفوں پر آیا کرتے تھے۔'' (۱)

ناول کے زبان واسلوب پر اسلم آزاد کا اعتراض کچھ یوں ہے:

''ناول کے اسلوب پر قراۃ العین کا واضح اثر ہے۔ لیکن عبداللہ حسین ''قراۃ العین کے اسلوب کی کامیاب تقلید نہ کر سکے۔ اور شروع سے اخیر تک اپنے ناول میں طرزِ تحریر کے کسی ایک رنگ کو نبھانے سے بھی قاصر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول کے اسلوب پر انگریزی ادب کا گہرا اثر ہے۔ جملوں اور فقروں کی ترتیب بھی انگریزی طرزِ تحریر کی طرح معلوم ہوتی ہے۔''(۲)

احسن فاروقی کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے عبداللہ حسین نے کہا ہے کہ:

''اس ناول کی زبان کو ایک خاص مقصد کے ماتحت بگاڑا گیا تھا۔''(۳)

ہوسکتا ہے مصنف کا مقصد زبان کے توسط سے کرداروں کی اُس عہد کی حقیقی تصویر پیش کرنا ہو۔ کیونکہ زبان ہی وہ واحد ہتھیار ہے جس کے ذریعے فرد کی حقیقی تصویر کشی کی جاسکتی ہے۔

۱۔ سہیل بخاری — اردو ناول نگاری — ص:۲۶۸
۲۔ ڈاکٹر اسلم آزاد — اردو ناول آزادی کے بعد — ص:۲۴۱
۳۔ عبداللہ حسین — بشمولہ سیپ کراچی — ص:۲۵۸

ان تمام اعتراضات اور خامیوں کے باوجود ''اداس نسلیں'' کی زبان و بیان کی کچھ خوبیاں بھی ہیں مثلاً اس میں کرداروں کی مناسبت سے زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ اگر کوئی گاؤں کا سادہ باشندہ ہے تو وہ اپنی صلاحیت کے مطابق بات چیت کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی زیادہ تر گفتگو اپنے مویشیوں اور کھیتوں کے متعلق ہی ہوگئی۔ مثلاً جب نعیم گاؤں آتا ہے تو اس کا والد نیاز بیگ اُسے اپنے مویشیوں کے بارے میں بتاتا ہے:

''میں نے اس سال تیسرے مہینے میں خریدا تھا۔'' نیاز بیگ نے اپنے خشک مضبوط ہاتھ سے بیل کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ ''چار من غلے میں آیا پچھلی منڈی میں اسے کاغذ ملا تھا۔ بہترین نسل کا جانور ہے کیوں چوہدری؟

''ہاں چوہدری'' میراسی نے جواب دیا۔

''بیس بیس کوس میں اس کا جواب نہیں۔''(۱)

یہاں اگر مصنف فلسفیانہ زبان استعمال کرتا تو یقیناً کسانوں کی واضح تصویر ابھر کر سامنے نہ آسکتی اس لیے مصنف نے کسانوں کی ذہنی سطح کے مطابق زبان استعمال کی ہے۔ جو ناول کی خوبصورتی کا باعث ہے۔

''اداس نسلیں'' میں ہر کردار اپنے زبان و بیان کے لحاظ سے اپنی سطح برقرار رکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ انگریزوں، مزدوروں، فلسفیوں، تعلیم یافتہ افراد اور کسانوں کی زبان کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس لیے اس کی زبان کو ادبی معیار سے گرا ہوا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اسی زبان کی وجہ سے ناول میں مختلف لوگوں کی نمائندگی کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ناول میں زبان و بیان کا ایک نیا انداز متعارف کروایا گیا ہے جس میں انگریزی، اردو اور پنجابی کے الفاظ مل کر ایک نئی زبان کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ تاہم کہیں کہیں ناول کی زبان فحش گوئی اور گالیوں کی بھرمار کی وجہ سے بری لگتی ہے۔

الغرض ''آگ کا دریا'' اور ''سنگم'' کے بعد ''اداس نسلیں'' وہ ناول ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر پاکستان بننے تک کے تمام سیاسی، تاریخی، اور معاشرتی واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اور ان واقعات سے متاثر ہونے والی نسلوں کی نفسیاتی الجھنوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ''اداس نسلیں'' کی کہانی ہندوستانی معاشرے سے براہ

۱۔ اداس نسلیں ص:۴۴

راست متعلق ہے۔اس میں پہلی جنگ عظیم کے اثرات، کسانوں کی حالت، فیکٹری ملازمین کی حالت، سیاسی تحریکات اوراس سے متاثر ہونے والے افراد کی مشکلات کو بیان کیا گیا ہے۔

''اداس نسلیں'' کے مصنف نے اس ناول کے سرنامے پر کچھ یوں لکھا ہے:

''ہرادیب اور شاعر اپنی ہم عصر نسل کے لیے لکھتا ہے۔ یوں کبھی نہیں ہوا کہ کوئی ادیب قلم اٹھائے اور کہے کہ ''اب میں آنے والی نسلوں کی خاطر ادب تخلیق کرتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔'' ہاں اگر اس کے بعد دوسری نسل بھی اس کے ادب کو اسی شوق سے پڑھتی ہے۔اوراس کے ساتھ اپنے کو اسی قدر منسلک و مربوط محسوس کرتی ہے تو یہ بات گویا بونس کے طور پر ہوتی ہے اور اس سے اُسے وہ جو کہ آخر قلم کا مزدور ہی ہوتا ہے اتنی خوشی حاصل ہوتی ہے جتنی کہ کسی بھی محنت کش کو عید کے موقع پر ایک ماہ کی زائد تنخواہ کے ملنے کی ہوتی ہے اور وہ اس پر شکر گزار ہوتا ہے۔ گو کہ یہ کوئی عطیہ نہیں بلکہ اُس کا اپنا حق ہوتا ہے۔''(۱)

ا۔عبداللہ حسین	اداس نسلیں	لندن یکم جنوری ۱۹۸۲ء

باب سوم

''اداس نسلیں فکری نقطۂ نظر سے''

عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' بیک وقت سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور تاریخی ناول ہے۔ ناول نگار نے اس ناول میں انتہائی فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن میں معاشرتی اور سماجی حقائق کے ساتھ معاشرے اور سماج میں رہنے والے لوگوں کی نفسیات اور جذبات بھی موجود ہیں۔ ناول میں بہت سے نا گفتہ حالات و واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ وہیں یہ حالات و واقعات جن لوگوں کو درپیش آئے ہیں۔ ان کے دھڑکتے دل، ان کی سوچیں، آتی جاتی اور ٹوٹتی سانسیں، خدشات، تجربات اپنے اپنے احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ انتہائی موثر طریقے سے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایک سچا اور حقیقی ناول ہے جو اپنے عہد کے معاشرے کی مکمل تصویر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں عبداللہ حسین نے اپنی نسل کی مایوسیوں اور محرومیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کہ یہ وہ نسل ہے جس نے ایک ملک کو ٹوٹتے ہوئے اور ایک معاشرے کو بکھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جہاں تمام انسانی قدریں مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ انسانوں نے انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ لاکھوں لوگوں کی عزتیں خاک میں مل گئیں اور لاکھوں اس میں مارے گئے۔ اس تمام افراتفری کے پیچھے ایک برح طرح الجھی ہوئی سیاسی، معاشرتی اور نظریاتی صورتحال تھی جس کو راوی نے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول میں تاریخ کے مختلف ادوار کو تہہ بہ تہہ کھولا گیا ہے۔ اس ناول میں پس منظر کے طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو پیش کیا گیا ہے۔

جنگ آزادی کے بعد کی صورت حال کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ کس طرح بعد میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تصادم کی فضا پیدا ہو گئی اور ہندوستان مختلف طبقوں میں منقسم ہو گیا۔ ان طبقات کے مختلف کردار عبداللہ حسین

نے متعین کیے ہیں۔ان میں بعض روشن علی خان جیسے لوگ اپنے مفادات کی خاطر انگریزوں کی جان بچا کر اُن سے جاگیریں حاصل کر رہے ہیں۔ایسے لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں اقوام میں موجود تھے۔جنھوں نے اپنی قوم سے غداری کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں سے انعام کے طور پر زمینیں اور جاگیریں حاصل کیں اور اس طرح عام کلرک سے جاگیردار بن گئے۔لیکن اس کے ساتھ ان لوگوں کے گھروں میں کچھ ایسے ملک پرست اور وطن پر قربان ہونے والے بھی موجود تھے۔

ہندوستان میں اس دور میں بسنے والے مختلف طبقات کے افراد اور مختلف نظریات رکھنے والے افراد اس ناول میں نظر آتے ہیں۔بعض مفاد پرست تو بعض وطن پرست۔اسی طرح انہی طبقات نے جن دو طبقوں کو جنم دیا ہے یعنی غریب اور امیر، جاگیردار اور کسان، اور جس کے باعث ایک طبقاتی کشمکش شروع ہو چکی ہے۔اس طبقاتی کشمکش کو بھی ناول نگار نے ابھارا ہے۔کہ ایک طرف تو غریب کسان ساری زندگی محنت کرتا ہے۔نہ اس کو دن میں سکون کے لمحے میسر آتے ہیں اور نہ رات کو۔وہ سال بھر فصلوں کے پکنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔اُسے پل پل ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں بارش نہ ہو جائے اور اس کی ساری محنت غارت نہ ہو جائے۔یہ کسان کیونکہ غریب ہوتے ہیں اس لیے ہر کوئی انہیں بے عزت کر سکتا ہے۔ان لوگوں پر ہر کسی کا بس چلتا ہے۔اگر سیاست دان ہوں تو وہ انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت سادہ لوح ہوتے ہیں۔اسی طرح حکومت ان غریب کسانوں سے جبراً کوبھی کام کروا سکتی ہے۔جس طرح ناول میں دکھایا گیا ہے کہ روشن پور کے غریب کسانوں کو جبراً انگریز فوج میں بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ناول میں روشن پور کے نوجوانوں کی صورت میں تمام ہندوستان کے نوجوانوں کا ذکر ہے۔جن کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔لیکن انگریز چونکہ ان کے مالک بن بیٹھے تھے اس لیے انہیں زبردستی جنگ پر بھیج دیتے ہیں۔یہ لوگ انکار کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا انکار کرنے کا خمیازہ ان کے تمام گھر والوں کو بھگتنا پڑتا تھا۔اس ناول میں نعیم اور مہندر سنگھ جیسے لاکھوں نوجوان زبردستی سپاہی بنائے گئے اور نامعلوم دشمن سے لڑنے کے لیے جانوروں کی طرح باندھ کر یورپ اور افریقہ کے محاذوں پر جرمن فاشسٹوں کے پاس بھیجے گئے۔جن میں بہت سے نوجوان وہی پر مارے گئے۔کچھ اپاہج ہونے پر ملک واپس بھیج دیئے گئے۔اور جو زندہ رہے اُن میں بہت سے نوجوان نفسیاتی

بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ عبداللہ حسین نے اس ناول میں بڑی چابکدستی سے ان کیفیات کو بیان کیا ہے۔

ناول میں ایک جگہ مہندر سنگھ کے الفاظ سے ان کیفیات کا بغور مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

''تمہیں پتہ ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟ اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا۔

''جرمنوں نے حملہ کیا ہے''

''کہاں؟ روشن پور پر؟

''یہاں''

پر ہم یہاں کیوں ہیں'' ہم کس لیے آئے ہیں؟''

''جرمن انگریز کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں بس۔''

''ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں۔''

''انگریز روشن آغا کے مالک ہیں۔'''' چنانچہ''

''کل کتنے مالک ہیں۔ ایک دفعہ بتاؤ'' وہ چڑ کر بولا۔

نعیم کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی۔'' (۱)

یعنی ہندوستانیوں کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کیوں لڑ رہے ہیں اور ان کا اصل مالک کون ہے، ناول نگار نے بہت خوبصورت اور دلکش انداز میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ گاؤں کے سادہ لوح لوگ جن کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتیں ہیں ان سے جب یہ خوشیاں چھین لی جاتیں ہیں تو وہ ذہنی طور پر الجھ جاتے ہیں۔

اس ناول میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ایک طرف تو ملک میں جنگ وجدل کی صورتحال تھی اور دوسری طرف ملک کے جاگیردار اُسی طرح دعوتوں اور خوشیوں کی محفلوں میں مصروف تھے۔ اس کی مثال عبداللہ حسین نے روشن محل کی صورت میں دی ہے۔ جہاں انگریز آقاؤں کی اُسی طرح خوشامد کی جارہی تھی۔ زوال پذیر معاشرے کی عکاسی راوی نے ''روشن محل'' کے افراد کی صورت میں کی ہے۔ جو کہ اب بھی انگریزوں کے انعامات اور خطابات کو نسل در نسل منتقل کرنے کے لیے محفلیں منعقد کر رہے تھے اور یہی جاگیردار اصل میں کسانوں کا استحصال کر رہے تھے۔ خود تو آرام

۱۔ اداس نسلیں ص: ۱۲۷

سے بیٹھے تھے اور غریب کسانوں پر طرح طرح کے ٹیکس لگا رہے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنے عیش وعشرت کا سامان تو ضرور کرنا تھا۔ اور اسی لیے روشن آغا اپنے گاؤں کے غریب کسانوں پر موٹرانہ کے نام سے ٹیکس لگاتے ہیں، تاکہ ان لوگوں کے عیش وعشرت میں کمی نہ ہو سکے۔ اس ناول میں روشن آغا کے روپ میں تمام جاگیرداروں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ ان لوگوں کو اپنے ملک سے کوئی لگاؤ نہیں، بلکہ انھیں انگریزوں سے اپنے مفادات کا حصول پیارا ہے اور اس حصول کے لیے ان کا انگریزوں کے ساتھ وفادار رہنا بہت ضروری ہے۔

اس ناول میں جنگ عظیم اول کے حوالے سے دکھایا گیا ہے کہ گاؤں کے نوجوان جنگ میں زبردستی بھیجے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کو جب انعامات دیئے جاتے ہیں تو وہ خوشی خوشی ان انعامات کو قبول کر لیتے ہیں۔ ناول کے کردار ''نعیم'' کو جب انگریزوں کی طرف سے جائیداد ملتی ہے تو نہ صرف اس کے گھر والے اس سے بہت خوش ہوتے ہیں بلکہ تمام گاؤں والے اس کی پہلے سے بڑھ کر عزت کرنے لگتے ہیں اور نعیم گاؤں والوں کے لیے ایک ہیرو کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس ناول میں فکری طور پر یہاں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ لوگ بظاہر تو انگریزوں کے ظلم وستم سے تنگ ہیں اور ان سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کے دیئے ہوئے انعامات کو واپس کرنے کے بجائے سینہ سے لگاتے ہیں۔

اس ناول میں فکری طور پر اس نقطہ نظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ دہشت پسند یا انتہا پسند کس طرح جنم لیتے ہیں۔ اس ناول میں دہشت پسندوں کے جنم لینے کی اصل وجہ بھی معاشرتی بے انصافی، جاگیردارنہ ظلم اور طبقاتی تقسیم ہی بتائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اس ناول میں اُس دور کے ہندوستان میں رہنے والے اچھوتوں کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نعیم ایک زمانے میں دہشت پسندوں کے گروہ سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اسی گروہ میں اس کی ملاقات اچھوت طبقے سے تعلق رکھنے والے ''مدن'' اور اس کی بہن ''شیلا'' سے ہوتی ہے۔ مدن اس کو بتاتا ہے کہ کس طرح وہ اچھوت طبقے سے متعلق ہونے کیوجہ سے زمینداروں کے مظالم سے تنگ آ کر گاؤں چھوڑ کر دربدر بھٹکنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس کی عمر اس وقت پچیس برس تھی۔ لیکن اُس نے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ اس سماج اور نظام فکر میں

احساس جرم جیسی کوئی شے باقی نہیں بچی ہے اور وہ جس بے رحم سماج کے استحصال کا شکار رہا ہے۔ اس سے وہ انتقام لینا چاہتا ہے اور انتقام لینے کا واحد راستہ اس کے پاس تشدد ہے۔

اس ناول میں فکری طور پر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس معاشرتی بے انصافی اور بے رحمی کے باعث کتنے نوجوان اپنے مستقبل تباہ کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس ناول میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان حالات کو بہتر بنانے کا واحد طریقہ سماجی انصاف ہے، اگر معاشرے میں عدل وانصاف ہوگا اور کسی طبقے کا استحصال نہ ہوگا تو اس طرح کے حالات کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔

اس ناول میں عورت کے تین روپ نظر آتے ہیں۔ طوائف، باغی گوریلا اور تابعدار بیوی۔ لیکن طوائف کا کردار زیادہ نمایاں ہے اس ناول میں بانو کے کردار کے ذریعے نیک دل اور ایثار پسند طوائف کو دکھایا گیا ہے جو ''علی'' کو مسجد شہید گنج کے ہنگامہ سے بچاتی ہے۔ یہ دراصل وہ شیلا (بانو) ہے جو پہلے دہشت گردوں کے گروہ میں شامل تھی۔ یہ بھی طوائف کی طرح معاشرے کے ٹھکرائی ہوئی عورت ہے۔ جو بارہ برس کی عمر سے ہی لوگوں کی ہوس اور ظلم کا نشانہ بنتی رہی جو اچھوت تھی، عیسائی تھی اور پھر ہندو اور آخر میں مسلمان ہوگئی۔ وہ حالات سے مجبور ہوکر دہشت پسندوں کے گروہ میں شامل رہی۔ جن کا کام ریلوے لائنوں کو بموں سے اڑانا تھا۔ دوسری عورت بھی یہی بانو ہے جو ملک کے آزادی کے لیے مختلف تحریکوں میں شامل ہوتی ہے۔ تیسری عورت کا کردار عذرا کے روپ میں سامنے آتا ہے اور یہ کردار باقاعدہ طور پر ایک افسانوی کردار ہے۔ اس عورت میں مشرقی عورت کی وفا نظر آتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے لیے قربانی دیتی ہے۔ اس کا شوہر نعیم کئی بار اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے مگر پھر بھی جب وہ اس کی بیماری کی خبر سنتی ہے تو اپنی تمام رنجشوں اور انا کے بت کو پاش پاش کر کے اپنے شوہر کے پاس گاؤں پہنچ جاتی ہے اور اُسے بہتر علاج کی خاطر روشن محل لے آتی ہے اور اپنے شوہر کے علاج میں کسی قسم کی غفلت نہیں برتی اور آخر تک شوہر سے وفادار رہتی ہے۔

ناول کی فضا میں تحریک خلافت اور رولٹ ایکٹ کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ نعیم رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے میں شرکت کرتا ہے تو دوسری طرف سول نافرمانی تحریک کا اعلان ہوتا ہے۔ اس تحریک میں غلام ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے افراد شرکت کرتے ہیں۔ ناول نگار نے یہاں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اب غلامی کی

زنجیریں ہندوستانیوں کے لیے نا قابل برداشت ہو چکی تھیں۔لگتا تھا کہ اب وہ ذوق یقین کے ذریعے غلامی کی زنجیر کو پاش پاش کر دینا چاہتے ہیں۔آزادی کی دیوی حاصل کرنے کی خاطر،تحریک آزادی کے مجاہدوں نے جو مشکلات، تکالیف اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔نعیم کا کردار اس کی مثال ہے۔اس تحریک میں اس کی وکٹوریہ کراس کی زمین ضبط کر لی جاتی ہے اور اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ جو لوگ طوقِ غلامی اتار کر آزادی کی طلب میں اپنا تن،من دھن قربان کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ان کی زندگیاں جیلوں میں کٹ جاتی ہیں۔بے شمار ایسے افراد اس ناول میں دکھائے گئے ہیں جن کی اموات جیلوں میں ہوئیں۔آزادی کا نام لینے کے جرم میں وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیئے گئے اور ایسے لوگ دوبارہ جیتے جی اپنے پیاروں سے نہ مل سکے۔

اس ناول میں ناول نگار نے ایک مچھلی فروش کے ذریعے جلیانوالہ باغ کے کربناک اور خوف ناک واقعہ کو پیش کیا ہے۔جن میں انگریزوں نے ہندوستانیوں کا انتہائی بے دردی سے قتل عام کیا۔لوگوں کو سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ناول نگار نے اس سانحے کو خوبصورت مچھلیوں کی وباء سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح کسی وباء میں مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مرتی ہیں۔یہی حال جلیانوالہ باغ کے سانحے میں ہندوستانیوں کا ہوا۔ان کی لاشوں سے نالیاں،گلیاں اور میدان بھر گئے۔یہ سزا آزادی کی دی گئی تا کہ اس کے بعد کوئی آزادی کا نام نہ لے سکے۔ لیکن انگریزوں کے اس ظلم کے باوجود آزادی کی شمع اسی طرح جلتی رہی۔

اس ناول میں جہاں آزادی کی تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔وہاں اس میں فرد کے معاشرتی مسائل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔اس ناول میں کارخانوں کی زندگی،صنعتی دنیا کے مسائل،مزدوروں کی مشکلات،ہڑتالیں،ناکہ بندی کو علی کے کردار کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔اس حصے میں ہندوستان میں صنعتی نظام فکر کی ابتداء اور ٹریڈ یونین تحریک کی شروعات کا ذکر نہایت حقیقی انداز میں کیا گیا ہے۔کہ کس طرح نئے سرمایہ دار گاؤں سے آ کر بھرتی ہونے والے مزدوروں سے جانوروں کی طرح کام لیتے تھے۔اور اس کے بدلے انھیں قلیل اجرت دیتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گاؤں کے کھلنڈرے خوش مزاج اور زندہ دل کسان،فیکٹریوں سے مریض،چڑ چڑے اور سنگدل بن کر نکلتے تھے۔ یہ مزدور سارا دن کام کرتے تھے۔مکانوں کے لیے سیمنٹ بناتے تھے۔کپڑا بناتے تھے۔بجلی پیدا کرتے تھے۔لیکن ان

مزدوروں کے گھر کچے اور بند ڈبے ہوتے تھے۔ان کے مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ان کی زندگی بھوک، افلاس اور محرومی میں گزرتی تھی اور اگر اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے، ہڑتال کرتے، تو انھیں پولیس اور غنڈوں سے زدوکوب کیا جاتا۔ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ ہڑتالوں کی صورت میں ان مزدوروں کو وہ تھوڑی اُجرت بھی بند ہوجاتی۔جس کا نتیجہ ان مزدروں اور ان کے خاندان کے بیمار ہونے اور مرنے پر نکلتا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس ناول میں مزدوروں اور مالکان کے مابین تضادات کو نشانہ بنایا گیا ہے۔کہ ایک طرف تو مزدوروں کی زندگی میں بدحالی اور سہولیات کا فقدان ہے تو دوسری طرف خدمت کاروں اور مل مالکان کی زندگی میں ہر طرح کی سہولیات ہیں۔ان کے لیے ہر طرح کی تفریح کے ذرائع موجود ہیں۔عیش وعشرت اور سکون و آرام سے ان کی زندگیاں بھرپور ہیں۔ بظاہر مہذب اور شائستہ نظر آنے والے یہ سرمایہ دار، مزدوروں کا خون چوس کر ان کو ملازمت سے نکال پھینک دیتے ہیں۔اور تازہ دم وتوانا بیروزگار بھرتی کر لیتے ہیں۔اسی طرح یہ فیکٹریاں اور ملیں انسان اور انسانیت کی مقتل گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ جہاں منافع کی ہوس، طاقتور اور صحت مند نوجوانوں کو موت کی طرف دھکیلتی رہتی ہے۔

ناول میں گھٹن کی فضاء سے قاری کو باہر نکالنے کے لیے ناول نگار نے اس میں ایک چھوٹا سا شادی بیاہ اور پٹھانوں کی مہمان نوازی کا تذکرہ کیا ہے۔نعیم اپنے دوست امیر خان سے ملنے پشاور کے کسی نواحی گاؤں جاتا ہے۔جو قبائلی علاقے میں واقع ہے۔ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ان سخت پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کے دل اپنے دوستوں اور مہمانوں کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔شادی بیاہ کے ذکر سے ناول نگار نے قبائل کے رسم ورواج کی عکاسی بھی کردی ہے۔وزیر خان کی شادی کے موقعے پر حجرے میں گانے بجانے کی محفل، دلہے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنا، بارات کے ساتھ مشعلوں کا جلوس اور خٹک رقص ایسے واقعات ہیں جو مشرقی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ناول نگار نے قبائیلیوں کے رسم ررواج کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ایک مخصوص تہذیب کی عکاسی بڑے بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔

عبداللہ حسین اردو کے ناول نگار ہیں جنہوں نے یورپ کی فکری تحریکات اور خاص کر فلسفہ وجودیت کے

گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔''اداس نسلیں'' کی فکر میں نظریہ وجودیت مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔اس لیے اس ناول کے اس اہم رخ پر بات کرنے سے پہلے فلسفہ وجودیت پر تھوڑی سی بات کرنی ضروری ہے۔وجودیت کسی بندھے ٹکے فلسفیانہ اصول یا فارمولے کا نام نہیں۔جس کا حرف بہ حرف اطلاق ایک وجودی ناول کی تخلیق کے لیے ضروری ہے۔ یہ ایک ذہنی وفکری رویہ ہے۔ جسے مختلف وجودی مصنفین اور مفکرین اپنی منفرد سوچ اور طرز احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔سجاد حارث پال ٹیلچ (Paul Thllich) کے فلسفہ وجودیت کے الفاظ اپنی کتاب میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''وجودی تصور ہر ایک عظیم مصنف کی تحریر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو زندگی اور انسانی تقدیر کے مسائل کو زیر بحث لاتا ہے۔''(۱)

اگر چہ اس نظریے پر بعض لوگوں نے بڑی لے دے کی ہے۔اور وجودی مصنفین پر وہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ مصنفین ہر عظیم مصنف اور فلسفی کو کسی نہ کسی مفہوم میں خواہ مخواہ اپنی صنف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔اس کے برعکس وجودی مصنفین یہ دعوی کرتے ہیں کہ وجودی نقطہ نظر اور اس نقطۂ نظر کا ادراک اور اس کی بصیرت مختلف مقامات پر ادب،فلسفہ،اور مذہبیات، میں با آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

بیسویں صدی میں وجودی رویے اور نظریے نے با قاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس تحریک نے فن وادب پر گہرا اثر ڈالا۔وجودیت کی تحریک پر تین افراد یعنی آندرے ژند،سگمنڈ فرائڈ،اور سارتر کا گہرا اثر ہے۔

وجودی مفکرین اجتماعی زندگی کے مقابلے میں ''فرد'' کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ان کے فکر وفلسفے میں محض انسان کا انفرادی وجود اہمیت رکھتا ہے۔ان کے نزدیک طبقات یا گروہ ''فرد'' کی حیثیت اور آزادی کے دشمن ہوتے ہیں۔کیونکہ یہ طبقات اور گروہ اُسے ہر طرح کی ذمہ داری سے آزاد کر دیتے ہیں۔اس کے برعکس وجودی مفکرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہر فرد آزاد ہے اور اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔انتخاب کی اس آزادی اور ذمہ داری ہی سے ہر فرد ذہنی اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے اور اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ جاتے ہیں۔اس آزادی انتخاب کے باوجود یہ فرد اپنے انجام کو نہیں جانتا۔اس کا عمل زمان ومکان کے دائرے میں محدود ومقید ہوتا ہے۔چنانچہ بعض اوقات اپنے عمل کے

۱۔سجاد حارث   ادب اور جدلیاتی عمل   ص:۴۴

نتیجے میں اسے تباہی اور موت کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ انتخاب کرتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ ہمارا فیصلہ صحیح ہے یا غلط۔

سب ہی وجودی مفکرین موت کی المنا کی کو بحث کا خاص موضوع بناتے ہیں۔ہائی ڈیگر کے نزدیک موت کی مستقل آ گہی سے اصل زندگی ترتیب پاتی ہے۔موت جس آسانی سے زندگی اور وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔اس سے زندگی کی لایعنیت اور کھوکھلا پن ظاہر ہو جاتا ہے۔سارتر زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:

> ''ہمارا وجود بغیر کسی سبب و معقولیت اور ضرورت کے تحت دنیا میں نظر آتا ہے۔تمام زندہ افراد بغیر کسی وجہ کے دنیا میں آتے ہیں۔مجبوریوں اور کمزوریوں کا بوجھ اٹھائے زندہ رہتے ہیں۔وہ ایک دن حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔''(۱)

اس ضمن میں بعض وجودی مفکرین انسان کی تنہائی پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ خواہ کیسا ہی معاشرتی اور سیاسی نظام قائم ہو جائے۔انسان کی تنہائی اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ان کے نزدیک انسان تنہا اور نامعقول واقع ہوا ہے۔اور زندگی کی نامعقولیت کو کسی نظام سے دور نہیں کیا جاسکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وجودی تصورات ہماری فکری قوتوں کو مہمیز دیتے ہیں۔انسانی وجود کے مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔انسانی ذہن اور خیال کے ارتقائیں ہماری رہنمائی کی سعی کرتے ہیں۔تاہم یہ تمام تر تصورات وسیع تر مفہوم میں منفی تصورات ہی کہے جاسکتے ہیں۔سارتر نے اگر چہ منطق کا سہارا لے کر غیر حقیقی تصورات کا دفاع کیا ہے۔

مجموعی طور پر وجودی تصورات انسان میں مایوسی ، ناامیدی ، بے دل اور منفی رجحانات پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔لیکن وجودیت کے مسائل پر غور و فکر کرنا ذہنی آزمائش کا کھیل تو ہو سکتا ہے لیکن اپنے مضمرات کے لحاظ سے اسے بے ضرر نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ایک زمانہ تھا۔جب یورپ کے علمی حلقوں میں وجودیت اور وجودی تصورات کی بحث نے مستقل موضوع کا

۱۔ژاں۔پول۔سارتر　　　وجودیت اور انسان دوستی۔بشمولہ نئی تنقید　　　ص:۲۶۹

درجہ اختیار کر رکھا تھا۔ اربابِ علم میں ایک بڑی تعداد ان نظریات کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ وجودیت کے بارے میں عام تصور یہ تھا کہ ہر وہ تحریک جس میں فرد کی تباہی اور بربادی کا ہولناک نقشہ کھینچا جاتا ہے۔ ہر وہ ناول جس کے کردار بدی اور ذہنی اختلاط کے نمونے دکھائی دیتے ہیں اور جو ہماری شخصیت کا ارتفاع کرنے کے بجائے اسے مایوسی اور پستیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیتے ہیں۔ وجودی ادب کا شہ پارہ ہے۔ مختصر طور پر ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وجودی ادب کی بنیادی خصوصیت زندگی کا المیاتی احساس پیدا کرنا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر ''اداس نسلیں'' کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ناول میں مجموعی طور پر قاری کے ذہن میں زندگی کا ایک المیاتی احساس پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن بعض دانشواروں کے خیال میں ناول میں یقیناً المیاتی احساس وتصورات موجود ہیں۔ لیکن یہ المیہ اس دور کے ناگزیر حالات کا حصہ ہے۔ جو بذات خود المناک تھے۔ یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ درمیانی وقت ہے جب ایک طرف برطانوی سامراج برصغیر کا بری طرح استحصال کر رہا تھا۔ یہاں عوام کی جنگ آزادی کو خاک وخون میں ڈبو رہا تھا۔ عوام الناس پر ایسا استحصالی اور نوآبادیاتی نظام مسلط کیے ہوئے تھا۔ جس میں انسانی اقدار اور وقار کی دھجیاں تک اڑ گئی تھیں۔ دوسری جانب انگریز برصغیر سے رخصت ہونے لگا تو فرقہ وارانہ فسادات ایک وباء کی طرح پھوٹ پڑے تھے۔ شہر ویران اور گاؤں راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔ بچے تہہ تیغ کیے جا رہے تھے۔ عورتیں اغوا کی جا رہی تھیں۔ درندگی کا یہ عالم تھا کہ معصوم اور بے بس عورتوں کی لاشیں ننگی پڑی تھیں۔ ریل گاڑیاں انسانوں کے سر بریدہ لاشیں لیے پھر رہی تھیں۔ شاہراہوں سے انسانی خون کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور وحشت ناک کھیل سیاست اور مذہب کے نام پر کھیلا جا رہا تھا۔

یہ وحشت ناک اور شرم ناک زندگی ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے عبداللہ حسین نے اپنے ناول میں زندگی کا جو المیاتی احساس پیدا کیا ہے اسے نہ تو ہم ناول نگار کی ذہنی اختراع کہہ سکتے ہیں اور نہ قنوطی اور وجودی فلسفے کا شاخسانہ قرار دے سکتے ہیں بلکہ یہ تو ایک ایسی باشعور حقیقت نگاری ہے جس کی کڑیاں اس معاشرے سے مل جاتی ہیں۔ اس طرح اس ناول کو حقیقت نگاری یا انسان دوستی کے کسی مدرسۂ فکر سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے پہلے ان خیالات ونظریات کا مطالعہ ضروری ہے۔ جن کا اظہار خود ناول نگار اور ناول کے مختلف کردار

مختلف موقعوں پر کرتے ہیں۔اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ناول جوں جوں نقطہ عروج کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو زندگی،موت،انسان اوراس کی ازلی اورابدی تنہائی،آرٹ اورادب،مذہب اورصداقت،انصاف اورمحبت کے بارے میں کردار بڑی شدت سے بحث اورتقاریر کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔اب کہانی میں حرکت وعمل کا عنصر کم ہوتا جاتا ہے۔اوراس کی جگہ طویل طویل باتیں اور فلسفیانہ مباحث لے لیتے ہیں۔ان تقاریر میں بالعموم جوموضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ان کا تعلق بالواسطہ یابلاواسطہ طور پر وجودی تصورات سے قائم نظر آتا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار مثلاً نعیم کو ہی لیں وہ زندگی کے آخری لمحات میں ذہنی اختلاط کا شکار ہوجاتا ہے اور مسلسل زندگی اور کائنات کی حقیقتوں پر تبصرہ کرتا ہے اور ماضی کی پناہ گاہوں میں بھی بھٹکتا پھرتا رہتا ہے۔نعیم کی خود کلامی سے قاری جلد ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ نعیم فکر و احساس کے پنجرے میں مکمل طور پر بند ہے۔اور ناول کا یہ المیہ کردار جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

فرد یقیناً اپنے جوہر کا انتخاب خود کرتا ہے اور جب کوئی فرد اپنی داخلی اور خارجی حقیقتوں سے رشتہ منقطع کر دیتا ہے تو اس صورت میں اپنی موت کا خود انتخاب کرتا ہے اس صورت میں زندگی کی ہر سانس موت کا سایہ بن جاتی ہے اور فرد احساس کے محبس میں زندہ درگور ہوتا ہے۔نعیم بنیادی طور پر کسان کا بیٹا تھا جب وہ عذرا کی اونچی چھتوں والی دنیا میں چور دروازے سے داخل ہوتا ہے تو اُس کا رشتہ زمین اور فصل سے کٹ جاتا ہے اور بقول علی وہ جاگیردار کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اور یہی سے اس کی زندگی کا المیہ شروع ہوتا ہے،کسان ذہن،کسان فلسفے اور جاگیردارانہ ذہن اور طرز معاشرت میں کھینچا تانی شروع ہوجاتی ہے اور یہ کشمکش اس کی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہتی ہے۔اگرچہ اس کی جسمانی معذوری اور بیماری بظاہر اس کی زندگی اور سوچ کے نئے دھاروں کو نئی سمت دینے کی ذمہ دار دکھائی دیتی ہے،لیکن یہ عوامل اس کی زندگی کے خارجی پس منظر کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔جنھوں نے اس کے ذہن اور سوچ کو مسلسل شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔

نعیم کی یہ نفسیاتی کیفیت ان الفاظ میں پیش کی گئی ہے:

”جسمانی معذوری اور دل کی غمخواری کے باعث اس کے پاس زندگی کا

ایک راضی بہ رضا نظریہ تھا۔اس نے کبھی سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔زندگی میں واقعات اتنی تیزی سے اوراس قدر بے اختیاری طور پر رونما ہوئے تھے اور انھوں نے اس طرح اسے آگے آگے چلایا تھا کہ نظریہ قائم کرنے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔لاشعوری طور پراس نے زندگی کے خارجی اثرات کو، اتفاقات اور حادثات کوقدرت کی برتر قوتیں تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کوان کے حوالے کردیا تھا۔ذہنی بے چارگی کے اس عالم کواس نے محسوس ہی نہ کیا تھا۔اس نے تو ذہن کے باہر رہ کرعمر گزاری اور دنیا دیکھی تھی اور یہ ردعمل اُسے خاصا دلچسپ اور سہل لگا تھا۔سوچ سے وہ ہمیشہ گھبراتا تھا۔۔۔نامعلوم کے خوف نے اس کوزندگی کے دھارے کا رخ بدلنے سے روکے رکھا تھا۔گو مادی اور جبلی زندگی جو وہ بسر کر رہا تھا اسے کچھ راس نہ آئی تھی۔اس نے اسے عظیم جسمانی اور دلی روگ دیئے تھے۔اور شدید غمخواری نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔لیکن اتنی ستم گری کے بعد نامعلوم کا خوف انتہا کو پہنچ چکا تھا۔۔۔اصل آفت وہ ہے جو ذہن اور روح پر آتی ہے اور جس سے دل کا سکون غائب ہو جاتا ہے اور ڈر کے مارے آدمی نیند میں اٹھ بیٹھتا ہے۔"(۱)

نعیم جس نے ذہن کے باہر رہ کرعمر گزاری تھی اور جو سوچ سے ہمیشہ گھبراتا تھا۔بالآخراس گہرے داخلی رویہ کے باعث زندگی کے آخری لمحات میں دیگر کرداروں کی طرح فلسفے کو اپنے اردگرد اوڑھ لیا تھا۔اس کی اس فلسفے کی وضاحت مندرجہ ذیل اقتباسات سے کی جاسکتی ہے:

"خدا اور انسانی روح تخلیق کے عمل کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور یہ ایک ہی شے ہے۔۔۔حسن! ہی اتنی ہی زبردست اور بے پایاں

۱۔اداس نسلیں ص:۳۹۹۔۴۰۰

قوت ہے جتنے اس کے دونوں خالق، اور بہت بڑی قوت ہے۔ محبت اور مذہب اور موت سے بڑی، زندگی سے بھی بڑی۔ کیونکہ یہ چیز ادبی تخلیق ہیں، محض وہ قوتیں ہیں جو اعلیٰ تخلیق کی طرف ابھارنے میں مددگار کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔'' (۱)

اسی طرح ایک اور جگہ یوں کہتا ہے:

''تمہیں پتا ہے کہ مذہب ہی ایک ایسا علم ہے جس نے کسی حد تک زندگی اور موت کے اسرار کو سمجھا اور بیان کیا ہے؟ مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے اس سے آگے دلائل ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے ایمان شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ پوشیدہ رو ہے جو تمام مذہب کی تہ میں رواں ہے۔ ایمان، یہ تجریدی اور تقریباً غیر دلچسپ لفظ جس میں انسانیت اور خدائیت کے وسیع تر معنی پوشیدہ ہیں۔'' (۲)

وجودی تصورات اور موضوعات کی بحث صرف ناول میں نعیم تک محدود نہیں رہتی۔ یہ سلسلہ فلسفیانہ افتادِ طبع کے حامل کچھ اور کرداروں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ کردار کھل کر ان مسائل پر بحث کرتے ہیں، جو ہر قسم کے وجودی تصور میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً وجودی تصورات میں اجتماعی زندگی کے مقابلے میں فرد کا مطالعہ اہمیت رکھتا ہے۔ ناول میں ایک کردار کیپٹن مسعود اس کا اظہار یوں کرتا ہے:

''جب انسان، مرد و عورت، اپنی انفرادیت کو کھو دیتے ہیں تو پھر جماعت اوپر آ جاتی ہے اور سوسائٹی اور ہم سب جانتے ہیں کہ سوسائٹی میں اس وقت سب سے بڑی طاقت لوگ نہیں ہیں۔ اغراض و مقاصد ہیں، اس نظام کے بنانے میں سب چیزیں مدد کرتی ہیں۔ ہمارے اصول، ہماری ڈس الوژن منٹ، ہماری سطحیت اور ازلی حماقت کا احساس سب! جانتے ہو۔ اس وقت

۱۔ اداس نسلیں ص: ۵۱۵

۲۔ ایضاً ص: ۵۱۶

انسانوں کی سوسائٹی میں سب سے جاندار قوت امارت یا غربت یا قومیت یا
مذہب یا کمیونزم نہیں ہے۔خود غرضی ہے۔منظّم ومنور خود غرضی۔‘‘(۱)

اس طرح یہ کردار دوسری جگہ کہتا ہے:

’’آج جو کہیں بھی نہیں ہے ہمارا ضمیر یا مذہب یا احساس ذمہ داری نہیں،
ہماری شخصیت ہے۔ہم جو کھو چکے ہیں،ضائع کر چکے ہیں ہماری انفرادیت
ہے۔۔۔آج فرد کہیں نہیں ہے۔محض غول ہیں۔‘‘(۲)

فرد کی ’’تنہائی‘‘ اور ’’موت‘‘ وجودی فلسفے کے محبوب ترین موضوعات ہیں۔اس کی جھلکیاں ناول کے آخر میں بہت زیادہ ملتی ہیں۔اس وجودی فلسفے کی چند اور جھلکیاں دیکھیے:

نجمی کی شادی کیپٹن مسعود سے ہو جاتی ہے اور وہ بظاہر محبت اور اطمینان کی زندگی بھی بسر کرتے ہیں۔لیکن نجمی شام کی شفاف اور خوشگوار فضا میں برآمدے میں بیٹھے سوچا کرتی ہے:

’’اور اندر تمہارا خاوند موجود ہے جو تم سے محبت کرتا ہے لیکن پتا نہیں کیا سوچتا
ہے۔تم کبھی اس کی سوچ کو جان سکتی ہو؟ باوجود ساری باتوں کے کبھی اس
کے خوابوں میں شریک ہو سکتی ہو؟ ہم کس میں شریک ہیں؟ محض اپنے آپ
میں۔اپنے خواب ہم آپ ہی دیکھتے ہیں اور تنہا ہیں۔‘‘(۳)

موت کے بارے میں پارلیمانی سیکرٹری انیس الرحمٰن کچھ یوں اظہار خیال کرتا ہے:

جب آفتیں نازل ہو کر مکمل طور پر ان کی نفی کرتی اور تمام انسانی زندگی کو ابدی
طور پر بے معنی ثابت کرتی ہیں۔وبا کے بعد اگر ایک شہر میں سو یا دو سو آدمی بچ
جاتے ہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ زندگی کی نشانی ہے؟ یہ موت ہے۔ایک
انسان کی موت سب کی موت ہے کیونکہ زندگی یکساں ہے اور موت بہر حال
وجود،تمہاری یا میری یا میرے بچوں کی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اگر میں

۱۔اداس نسلیں ص:۴۷۹۔۴۸۰

۲۔ایضاً ص:۴۸۰

۳۔ایضاً ص:۵۵۰

تمہیں قتل کرتا ہوں تو پھانسی پر چڑھوں گا نہیں کرتا تو قحط میں مروں گا یا جنگ میں کسی گلی یا ہسپتال ہی میں مر جاؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟'' (۱)

نجمی کے اعصاب پر بھی ''موت'' سوار ہے۔ اور وہ موت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے:

''تم جو اتنے معتبر بنے بیٹھے ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ کرنل یا جنرل بن کے مرو گے ؟ ٹھیک ہے۔ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ بہر حال مرو گے۔ تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟ کون فائدے میں رہا۔ تم یا موت؟ میدان جنگ میں یا ملٹری ہسپتال میں یا کسی بھی ہسپتال میں آخری فیصلے میں گھاٹے میں تم ہی رہو گے۔'' (۲)

ناول کے تمام کرداروں پر جرمنی کے سوشلسٹ مفکرین کی طولانی اور تصوراتی بحث کے اثرات ملتے ہیں۔ جن کی انیسویں صدی میں بڑی دھوم تھی۔ اور جو انسانی جوہر کی تلاش شعور کے حوالے سے کیا کرتے تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز انسانی شعور تھا۔ جسے مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ کر دیکھا کرتے تھے۔ یہ دراصل ایک تصوراتی فلسفہ تھا۔ جس مدد سے حیات و کائنات کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لیکن مارکسی نقطۂ نظر کے مطابق انسان کے کسی مسئلہ کو سماجی یا سیاسی اور معاشی نظام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انسان خلا میں نہیں بستا ہے۔ بلکہ مخصوص مادی حالات کی وجہ سے اس کے ذہن کی طرز فکر تشکیل ہوتی ہے۔ اس لیے مارکسی فلسفہ میں وہ نظریہ بے معنی ہے جو عمل نہیں بنتا۔ بلکہ ایک ذہنی مغالطہ ہے۔

اب جو لوگ اپنے فکر و احساس کے ڈھانچے کو مادی اور سائنسی بنیادوں پر استوار نہیں کرتے۔ یا محض اپنے شعور کے مجسس میں زندگی کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اضطراب، مایوسی اور تنہائی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پارلیمنٹری سیکرٹری انیس الرحمان ایک دم بڑھاپے کی طرف جاتا ہے اور اپنے گھر والوں سے الگ ایک کھوٹی میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ زندگی ہمیں کس بیدردی سے ضائع کر دیتی ہے۔

۱۔ اداس نسلیں ص: ۴۵۸

۲۔ ایضاً ص: ۵۵۱

دوسری جانب کیپٹن مسعود یہ کہنے لگتا ہے:

''ہم بھیڑوں کے گلے کی طرح ایک مشترکہ حماقت میں بندھے ہوئے ہیں۔مشترکہ بدبختی میں۔میں تم سے محبت کرتا ہوں۔اس لیے کہ میں سوچتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔میں تمام لوگوں سے محبت نہیں کرتا اس لیے کہ میں سوچتا ہوں کہ سارے لوگوں سے محبت نہیں کرسکتا۔نتیجہ میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔'' (۱)

ناول کے آخری حصے میں اعلیٰ طبقے کی زندگی اور طرز فکر کا یہ نمائندہ شخص کیپٹن مسعود سمندر کے ریتلے ساحل پر نجمی کے سامنے عجیب رقص کرتا ہے۔جس میں کوئی قاعدہ اور نظم وضبط نہیں۔جس میں سمت کا احساس نہیں۔نجمی اور کیپٹن مسعود اپنے شعور و احساس کے مجسس میں پھنسے زندگی گزارتے ہیں۔وہ دونوں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔

ناول نگار نے برصغیر پاک وہند کے نوے سالہ تاریخی دور میں صرف ان افراد کا انتخاب کیا ہے جو تاریخی جبریت کا شکار ہیں۔غلامی اور نوآبادیاتی نظام نے جن کی روحوں کو کچل کر رکھ دیا ہے جو زوال پذیر طبقات کے ترجمان اور نمائندے ہیں۔اور جن کی زندگی کی داستانیں اور جن کے خیالات ہمارے اندر یاس انگیز فکر کو پیدا کر سکتے ہیں، زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو قبول کر کے زندگی کو سمجھنے اور اسے تبدیل کرنے کا جذبہ اور حوصلہ نہیں عطا کر سکتے۔نوے برس کے اس تاریخ دور کی معاشرتی زندگی حقیقت اور سچائی سے خواہ کتنی قریب ہی کیوں نہ ہو، ہمارے قدموں کو زندگی کی نئی ترقی پسند جہت سے روشناس نہیں کرا سکتی۔مزید یہ کہ ایک خاص مفہوم میں ہم اسے ادب میں مقصدیت کی نفی بھی کہہ سکتے ہیں اور ادب میں مقصدیت کی یہ نفی بعض صورتوں میں زندگی کی نفی تک بھی جا پہنچتی ہے۔

اس نوے سالہ تاریخی دور میں بالخصوص پہلی جنگ عظیم کے بعد برصغیر پاک وہند میں، محدود پیمانے پر ہی سہی لیکن ایک رچے ہوئے طبقاتی شعور کے ساتھ عوام نے کئی مقامات پر منظّم انقلابی لڑائیاں لڑی تھیں۔عوامی اور انقلابی جدوجہد کا دہشت پسندوں کے مہم جو یا فلسفے اور عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔اس کے علاوہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ملک

۱۔اداس نسلیں ص:۴۷۸

میں ٹریڈ یونین تحریک منظّم ہو چکی تھی۔ بمبئی، احمد آباد، کانپور وغیرہ کے مزدور، مزدوروں کے انقلابی فلسفے سے لیس ہو چکے تھے۔ کسانوں کی تنظیمیں بن چکی تھیں۔ لیکن ناول میں محنت کش عوام کے ہراول دستے کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ اس ضمن میں شیلا یا بانو ہے۔ جو ایک کمزور اور ثانوی کردار کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کی شخصیت دیگر کرداروں کے مقابلے میں دب کر رہ جاتی ہے۔ ناول کا اہم کردار قنوطی اور دل و دماغ کا روگی نظر آتا ہے۔ ان میں ماضی کے اندھیروں سے نکلنے اور مستقبل میں ابھرتی ہوئی انقلابی قوتوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ایک نوآبادیاتی نظام اور استحصالی نظام نے اپنی ریشہ دوانیوں اور انسان دشمن سیاسی چالوں سے سادہ لوح عوام کو جس بیدردی سے خون کے جوہڑ میں پھینکا تھا۔ اس حقیقت کا کسی مقام پر بھی تذکرہ نہیں ملتا، حالانکہ عبداللہ حسین جیسے استعمار دشمن ناول نگار کے لیے یہ مشکل نہ تھا۔ ان کمزوریوں کے باوجود ناول اس دور کا ایک اہم تخلیقی شاہکار ہے۔ ناول میں بے شمار ایسے مقامات آتے ہیں۔ جہاں ناول نگار نے حقیقت نگاری کی مثالیں رقم کی ہیں۔ انگریزوں نے اس ملک میں جن خطوط پر اپنا نظام حکومت استوار کیا تھا۔ دیہات میں رہنے والے افراد کو اپنے کارندوں کے ذریعے جس طرح اپنا ماتحت بنایا تھا۔ یہ حقیقتیں نہایت موثر پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک استحصالی، بالخصوص نوآبادیاتی نظام میں جیل خانوں کی حالت اور ان سزا خانوں میں غریب محنت کش عوام کے بیٹوں کو مجرم بنا کر ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا جاتا۔ شانتی نگر شہر سے مل کی بستی اور اس بستی میں رہنے والے مختلف طبقات کی زندگی کی حقیت پسندانہ تصویر کشی، احمد دین مزارعے کا ''موڑانہ'' نہ دینا اور پھر اس کے گلے میں رسی باندھ کر اسے چوپایوں کی طرح زمین پر چلنے کے لیے مجبور کرنا، ناول نگار کی فنی چابکدستی اور فنی خلوص کے بہترین نمونے ہیں۔ یہ مناظر ایک رچے ہوئے سماجی اور طبقاتی شعور کے بغیر ناممکن تھے۔ جس کی اساس خلوص گہری انسان دوستی پر استوار ہوئی ہے۔ ناول نگار نے اپنے جاندار تخیل، قوت، مشاہدہ اور فکری قوتوں کے بل بوتے پر نوے برسوں پر محیط اس ملک اور معاشرہ کی ذہنی، سیاسی، جذباتی اور معاشرتی تاریخ مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے سلسلے میں جس جاگیردار اور تعلقہ دار طبقے نے جنم لیا ہے وہ جاگیردار طبقہ جن کا کلچر

صرف انگریزوں کی دعوتیں کرنا، شکار کرنا اور جنگ کی خاطر انسانوں کو ایندھن کے طور پر حکومت کے سامنے پیش کر کے خان بہادر اور رائے صاحب جیسے خطاب حاصل کرنا تھا۔ جن کی تعیش پسندی کی بنیادیں دیہاتوں سے آنے والے مزارعوں کی محنت کے ثمرات پر استوار ہو رہی تھی۔

جن کے لیے سیاسی تحریکات اور تغیرات ایک تماشہ کی حیثیت رکھتے تھے کہ جب دل چاہا تو ترنگ میں آ کر اس دھارے میں شامل ہو گئے اور جب بے کیفی کا احساس ہونے لگا یا طبقاتی برتری کے شعور نے ملامت کیا تو چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو گئے۔ اس طبقے کی عکاسی ناول میں کی گئی ہے۔ مثلاً نعیم اور عذرا، شوہر اور بیوی کے رشتے میں بندھے کردار ہیں۔ لیکن یہ طبقاتی شعور کے اس قدر اسیر ہیں کہ جب بھی ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں تو ان کی پیچیدہ نفسیاتی ساخت ان کے عمل کو جھوٹ، فریب اور منافقت کا احساس دلا کر یعنی کڑوا بنا دیتی ہے۔ یہ وہ ذائقہ ہے جو نعیم ناول میں مستقل طور پر اپنی زبان پر محسوس کرتا ہے۔ نعیم کسانوں کو منظّم کرنے کے لیے دیہاتوں کے دورے شروع کرتا ہے تو ابتداء میں تو عذرا ایک جذباتی رویے کے ساتھ اس کا ساتھ دیتی ہے لیکن بہت جلد اکتا جاتی ہے۔ اس کا جاگیردارانہ پس منظر جلد ہی اسے نفی بحران کا شکار بنا دیتا ہے:

> ''(اس نے) اپنے خاوند کے ہمراہ جانا چھوڑ دیا اور روشن پور بیٹھ کر اپنے دل میں شہری زندگی کی چمک دمک اور شہرت کی خواہشات کے زہر کو پالنے لگی۔''(۱)

مجموعی طور پر عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' میں برصغیر کے پسماندہ انسانوں کو پیش کیا ہے۔ جن کو برطانوی غلامی نے شکستہ تر کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے لیے تقسیم ہند مزید تباہی اور بدنصیبی لائی تھی۔ ان کمزور انسانوں کی اداس نسلیں، انسانی تاریخ کے ایک وحشت ناک عہد کی علامت ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان یوں رقمطراز ہیں:

> ''اداس نسلیں'' فکری طور پر ایک کامیاب ناول ہے۔ عبداللہ حسین نے ناول کی تخلیق میں جس فکری ''رو'' کو موضوعاتی تشخص دیا ہے اس کا دائرہ نسلوں کی تاریخ و تہذیب کے جذباتی اور فکری تار و پود میں محض ژرف نگاہی

۱۔ اداس نسلیں ص: ۲۵۹

کا وظیفہ نہیں۔ اس المیہ کا محاکاتی استعارہ بھی ہے۔ جو سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی زوال و ارتقاء کے تحت الشعوری ادراک سے ہم آمیزی کرتا ہے۔"(۱)

۱۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان آزادی کے بعد اردو ناول ص:۱۷۱

باب چہارم

''نتائج''

ناول کا بنیادی فریضہ اپنے عصر کے سماجی حالات اور مسائل کی پیشکش ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور پریم چند کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی وغیرہ نے اردو ناول میں حقیقت نگاری کے پہلو بہ پہلو مختلف طرح کے تجربات بھی کیے اور اردو ناول کو نئی جہات سے روشناس کرایا۔ تقسیم ہند کے بعد برصغیر کے سیاسی و سماجی زندگی میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تقسیم کے فوراً بعد اردو میں کافی ناول لکھے گئے۔ جن میں زیادہ تر کا موضوع اس دور کے ہندو مسلم فسادات تھے۔ یہ ناول اپنی ہنگامی نوعیت، جذباتی وفور اور تاثراتی نقطہ نظر کی وجہ سے اعلیٰ فنی نمونے نہ بن سکے۔ فکر کی گہرائی اور غیر جانبدارنہ حقیقت پسندی کے بجائے یہ ناول سطحی جذباتیت اور فکری بے راہ روی کے مرقعے بن کر رہ گئے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد ابھرنے والی اس ہنگامیت کے بعد ناول نگاری کے سفر میں چند اعلیٰ نمونے بھی سامنے آئے۔ جن میں عزیز احمد، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، انتظار حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور اور عبداللہ حسین کے ناولوں کو شاہکاروں کا درجہ حاصل ہوا۔ دیکھا جائے تو تقسیم ہند کے بعد لکھے گئے معیاری اردو ناول حقیقت شعاری اور عصری معاشرتی عکاسی کے نقطۂ نظر سے ترقی پسند تحریک کی قائم کردہ روایات کی توسیع ہی کر رہے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فسادات، ہجرت، نئی زمینوں کو آباد کرنے والے انسانوں کے نئے مسائل، نو تشکیل شدہ سوسائٹی میں مثبت قدروں کے بحران اور نئی اقتصادی و نفسیاتی تبدیلیوں وغیرہ کا اضافہ اس دور کے اردو ناول میں ہوا۔

فسادات اور ہجرت کے علاوہ اردو ناول میں جس واقعے کو سب سے زیادہ موضوع بنایا گیا وہ تھا ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ۔ جس نے بالخصوص مسلمانوں کی جذباتی اور اقتصادی زندگی پر کاری ضرب لگائی۔ ان

میں قراۃ العین حیدر، احسن فاروقی اورعزیز احمد کے ہاں جاگیرداروں کے خاتمہ پر اس طبقے کے Dislocate ہونے کا ذکر ملتا ہے۔لیکن عقیدت مندی کے ساتھ یہ ناول نگار جاگیرداروں کے جابرانہ پہلوؤں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کیونکہ اپنی ہمدردیوں اور ذہنی ترجیحات کی بناء پر یہ فنی عدم توازن کا شکار ہیں۔ان کی بہ نسبت قاضی عبدالستار اور جیلانی بانو کے ہاں جاگیرداری کے زیر سایہ پلنے والی منفی اقدار مثلاً اشراف پرستی،معاشی وسیاسی تبدیلیوں کے تئیں ظالمانہ بے حسی اور قدیم استحصالی اداروں کو برقرار رکھنے کی آرزو کا اظہار زیادہ بہتر اور حقیقت پسندانہ انداز سے نظر آتا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جاگیرداری کے زوال کو پنجاب کے ناول نگاروں نے اتنی عقیدت مندانہ نظر سے پیش نہیں کیا۔ کیونکہ پنجاب کے اردو مصنفین کا طبقاتی پس منظر یو۔ پی کے اکثر اردو ادیبوں کی طرح جاگیردارانہ نظام سے وابستہ نہ تھا۔اس لیے انتظار حسین اور قراۃ العین والا جاگیردارانہ اقدار سے لگاؤ، پنجاب کے ناول نگاوں مثلاً راجندر سنگھ بیدی اور عبداللہ حسین کے یہاں ناپید ہے۔

اس کے علاوہ انگریزی تسلط کے ساتھ برصغیر میں سرمایہ داری پر مبنی جزوی تہذیب یافتہ ہونے کا عمل شروع ہوا۔جس کے نتیجے میں شہروں کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔اس اضافہ کا بڑا حصہ گاؤں ،قصبات سے ہجرت کر کے شہروں میں نچلی بستیاں آباد کرنے والوں پر مشتمل ہے۔اس نئے صنعتی نظام نے جہاں لالچ ، ناانصافی اور ہوسِ منافع کو زیادہ عریاں شکل دی وہیں بیگانگیٔ ذات ،تنہائی ، بدعنوانی ،خودغرضی اور بے رحمی میں بھی شدید اضافہ ہوا۔کرشن چندر اور عبداللہ حسین نے برصغیر کے سب سے بڑے شہروں کے پس منظر میں سرمایہ دار و تاجر طبقے کی ہوس زر سے پیدا ہونے والی انسان دشمن صورت حال کو موضوع بنایا اور نچلی بستیوں میں پلنے والے ان کرداروں کو پیش کیا۔ جو صنعتوں اور تجارت کو MAN POWER فراہم کر کے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ اس دور میں عصمت چغتائی ،سائرہ ہاشمی ،انور سجاد اور علیم مسرور نے ہندو پاک کے نئے شہری معاشرے کے پس منظر میں سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں ہونے والے عورت کے جنسی استحصال کے باعث پیدا ہونے والی تنہائی اور بے چارگی کو موضوع بنایا۔

دیکھا جائے تو ہر بڑا ناول، جہاں کائنات سے اپنا تھیم اور کردار اخذ کرتا ہے وہیں وہ دنیاوی سروکاروں اور

حیات انسانی کی بے کیف تفصیلات سے ماورا خود ایک جہانِ معنی ہوا کرتا ہے۔ ایسا جہان معنی جہاں تخلیق کار قادرِ مطلق ہوتا ہے اور قاری اس کا بندۂ بے دم۔ اسی لیے کسی مختصر جائزے میں ایک عظیم ناول کی روح کو گرفت میں لانا اور اس کے کثیر الجہتی تناظر کو تنقیدی اصطلاحات کے ذریعے دوبارہ تشکیل دینا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' بھی ایک ایسا کثیر الجہتی ناول ہے۔ جس میں اُس عہد کے سماجی، سیاسی اور تاریخی مسائل کے ساتھ فرد کی نفسیاتی کیفیات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ''اداس نسلیں'' بھی جدوجہد آزادی اور تقسیم ہند کے عمل کے حوالے سے برصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کے پس منظر میں لکھے جانے والے اجتماعی ناولوں کی روایت کی ہی اگلی بڑی کڑی شمار ہوتا ہے۔ لیکن یہ ناول دوسرے ناولوں سے کسی حد تک مختلف ہے۔ اس کی وجہ اس ناول میں کلچر اور ثقافت کے سیاق وسباق میں تقسیم کے عمل کو انسانی احساسات اور جذبوں کی تقسیم کی شکل میں نہیں دکھایا گیا ہے۔ بلکہ ناول میں ''بنیادی آشوب'' فرد کا ہے۔ اس ناول میں ۱۹۱۳ء کے جذبات، احساسات، مسرتوں، خواہشوں، ناکامیوں، خوابوں اور خوف کو بڑے جاندار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس بارے میں اسلم آزاد نے یوں لکھا ہے:

> ''برطانوی غلامی کے پرآشوب دور نے ستم زدہ اور اعصابی سطح پر مجھول،
> یاس وحسرت بھری جو نسلیں پیدا کی۔ عبداللہ حسین نے واقعوں کے ذریعے
> ان کا موثر خاکہ پیش کیا ہے۔''(۱)

دیہات کی سخت کوش زندگی، لاحاصل جنگ آزادی، دہشت گرد تنظیم سے وابستگی، کانگرس میں شمولیت، جیل یاترا، جلسے جلوس ان سے مرکزی کردار نعیم کے تجربوں کی دنیا تخلیق ہوتی ہے اور انہی حوالوں سے عبداللہ حسین نے عصری زندگی کے بعض اہم مسائل اور حیات انسانی پر ان تصرفات کی معنویت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عبداللہ حسین نے ناول میں تاریخی شعور اور افراد کی نفسیات کو زیادہ تر مادی اور طبقاتی حوالوں سے منسلک رکھا ہے۔ ناول میں یہ ان کا عمومی رویہ ہے۔ سیاق وسباق میں ''مشترکہ کلچر'' کا حوالہ ملتا ہے۔ لیکن واقعاتی پس منظر کسی شخصیت کی تہذیبی

۱۔ ڈاکٹر اسلم آزاد　　　اردو ناول آزادی کے بعد　　　ص: ۲۳۵

اور ثقافتی تہہ داری کو ابھارنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ناول میں تقدیر اور اس کے سامنے انسانی بے چارگی کا مسئلہ ہے جو عام انداز میں کردار کے شعور میں تجربوں کی کڑواہٹ نامرادیوں کے تلخ ذائقوں اور مایوسیوں کی بجھی ہوئی راکھ سے عبارت ہے۔

اس ناول میں نہ صرف تاریخ کے مختلف ادوار کو تہہ بہ تہہ کھولا گیا ہے۔ بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی شہروں، دیہاتوں پر ان کے مخصوص کردار اور شخصیت کے مطابق اپنے نقوش مرتسم کرتی ہے۔ یہاں زندگی تین ادوار پر مشتمل دکھائی دیتی ہے۔اوّل برطانوی سامراج کا دور، دوسرا جدوجہد آزادی کا زمانہ اور تیسرا تقسیم ہند کے بعد کا دور۔ ''اداس نسلیں'' میں پنجاب کے کسانوں کی زندگی، جاگیرداروں کے مظالم واستحصال پسندی، کارخانوں میں خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں کی صنعتی نظام کے زیر سایہ چلنے والی محرومیاں اور ناآسودگیاں، شہر میں بسنے والے اعلیٰ طبقے کے مزاج وفکر اور دوسری جنگ عظیم میں جبریہ بھرتی کر کے محاذ پر دھکیلے گئے ہندوستانی کسانوں کی اجنبی دیاروں میں بے نام ونشاں جدوجہد وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ پریم چند کے ''گئودان'' کے بعد ''اداس نسلیں'' اردو کا پہلا ایسا ناول ہے جس میں بڑے کینوس پر گاؤں کے باشندوں کے روزمرہ کے دکھ درد، جان توڑ محنت اور فطرت وسماج کی اندھی قوتوں کے سامنے سینہ سپر رہنے کی کوشش دکھائی گئی ہے۔

اس کے علاوہ تقسیم ہند اور ہجرت کے سلسلے میں ہونے والی بربریت، عورتوں کا استحصال، بے حسی، خود غرضی، قافلوں کا لوٹ جانا، بھوک، بیماری اور انسانوں کے ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک دوسرے کا جانی دشمن بن جانا بھی اس ناول میں دکھایا گیا ہے۔ان کمزور انسانوں کی اداس نسلوں کے لیے ہجرت مزید تباہی اور بدنصیبی لے کر آئی تھی۔جس کو عبداللہ حسین نے انسانی تاریخ کے ایک وحشت ناک دور سے علامت کے طور پیش کیا ہے۔

فسادات اور ہجرت کے ان مناظر کے ساتھ ناول ختم ہو جاتا ہے۔ ''اداس نسلیں'' کے آخری حصہ کے طویل فلسفیانہ مباحث اور مذہب واخلاق کے تئیں نعیم اور انیس الرحمٰن کے تشکیک آمیز نظریات اس ناول کو ''آگ کا دریا'' کے ماحول اور مباحث کے قریب کر دیتے ہیں۔لیکن عبداللہ حسین انسان اور اس کی تعمیری صلاحیتوں سے مایوس نہیں ہیں۔اسی لیے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا ہے:

....

''میں یہ ضرور کہوں گا کہ ادب کی صورتحال میں تبدیلی لانا کسی فرد کا نہیں بلکہ تمام ادیب برادری کا کام ہے کہ وہ حقیقت پر مبنی زندہ اور توانا ادب تخلیق کرے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ادب اس سوسائٹی کا حصہ ہے اور وہ بھی عام آدمی کی طرح جبر کی صورتحال سے مایوسی کا شکار ہو سکتا ہے۔ مگر ادیب ایک عام آدمی سے زیادہ حساس اور ذمہ دار بھی زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اُس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بسا اوقات ادب تخلیق کرے جس کا تعلق اس کے اپنے معاشرے اور اس میں سانس لینے والے عام انسانوں سے ہو۔''(۱)

بلاشبہ ''اداس نسلیں'' سیاسی، تاریخی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اردو ناولوں میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ ناول فرد کی داخلی الجھنوں اور نفسیات کو زیادہ تر مادی وطبقاتی حوالے سے پیش کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ ناول اپنے ہم عصر ناولوں میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے اور بعد میں آنے والے ناول نگاروں کے لیے ایک نئے راستے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ عبداللہ حسین سے انٹرویو بشمولہ ماہ نو ص: ۵۷

مآخذ ومصادر

کتابیات

نمبر شمار مصنف کا نام	کتاب کا نام	ناشر	سن اشاعت
۱۔احسن فاروقی	ناول کیا ہے؟	دردا کادمی لاہور	۱۹۶۴ء
۲۔اسلم آزاد	اردو ناول آزادی کے بعد	سیمانت پرکاش دہلی	۱۹۹۰ء
۳۔اسلوب انصاری	اردو کے پندرہ ناول	یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۳ء
۴۔جمیل جالبی ڈاکٹر	تنقید اور تجربہ	اکرام احمد مشتاق بک ڈپو کراچی	۱۹۶۷ء
۵۔حسرت کاسگنجوی	ادب اور اقدار	اردو اکیڈیمی سندھ کراچی	۱۹۹۸ء
۶۔حمید اللہ صاحب زادہ	فن اور تکنیک	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۰ء
۷۔خالد اشرف ڈاکٹر	برصغیر میں اردو ناول	ایضاً	
۸۔سجاد حارث	ادب اور جدلیاتی عمل	محمد اکرام تخلیق مرکز لاہور	۱۹۷۲ء
۹۔سہیل بخاری ڈاکٹر	اردو ناول نگاری	میری لائبریری لاہور	۱۹۶۶ء
۱۰۔سید محمد عقیل	جدید ناول کا فن	نیا سفر پبلی کیشنز آلہ آباد	۱۹۹۷ء
۱۱۔عبدالسلام پروفیسر	اردو ناول بیسویں صدی میں	اردو اکیڈیمی سندھ کراچی	۱۹۷۲ء
۱۲۔عبداللہ حسین	اداس نسلیں	سنگ میل پبلی کیشنز	
۱۳۔ایضاً	قراۃ العین اور ناول کا جدید فن	اردو پبلی کیشنز لکھنؤ	۱۹۸۵ء
۱۴۔صدیق کلیم	نئی تنقید	سونا جی ٹرانسلیشن سوسائٹی لاہور	۱۹۶۹ء
۱۵۔فرمان فتح پوری ڈاکٹر	اردو نثر کا فنی ارتقاء	اردو اکیڈیمی سندھ کراچی	۱۹۹۸ء
۱۶۔کے۔کے کھرل	اردو ناول کا نگار خانہ	شیخ ربانی پریس لاہور	۱۹۹۱ء
۱۷۔ممتاز احمد خان ڈاکٹر	آزادی کے بعد اردو ناول	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۹۷ء

نمبر شمار مصنف کا نام	کتاب کا نام	ناشر	سن اشاعت
۱۸۔ممتاز احمد خان ڈاکٹر	اردو ناول کے بدلتے تناظر	ویلکم بک کراچی	۱۹۹۳ء
۱۹۔ایضاً	ادب اور شعور	اردو اکیڈیمی سندھ کراچی	۱۹۶۱ء
۲۰۔نسیم تقویٰ ڈاکٹر	تنقید اور آگہی	غضنفر اکیڈیمی اردو بازار کراچی	س۔ن
۲۱۔وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	اردو اکیڈیمی کراچی	۱۹۶۰ء
۲۲۔یوسف سرمست ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو ناول	ترقی اردو بیورو	۱۹۹۶ء
E.M Foster۔۲۳	Aspects of novel	Penuins U.K	1968

رسائل:۔

رسائل	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱۔خیابان (اصناف نثر نمبر)	شعبۂ اردو	۹۵۔۱۹۹۴ء
۲۔ساقی	کراچی	مارچ ۱۹۶۱ء
۳۔فنون	لاہور	۱۹۹۵ء
۴۔ماہ نو	لاہور	جولائی ۱۹۸۷ء
۵۔یونیورسٹی جنرل	پشاور	۹۷۔۱۹۹۶ء

انٹرویوز:۔

1. A Conversation with Abdullah Hussain (Part I)

2. Ideas and Identites of India Pakistan by (Rehan Ansari December 26,2006